جامعہ امام محمد انور شاہ دیوبند کا علمی، دینی، ادبی ترجمان

ماہنامہ

محدّثِ عصر

بانی

فخر المحدثین حضرت مولانا سید انظر شاہ مسعودی کشمیری رحمہ اللہ

مدیر

سید احمد خضر شاہ مسعودی

ورق در ورق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بانی

فخر المحدثین حضرت مولانا
سید انظر شاہ مسعودی کشمیری رحمہ اللہ

مدیر
سید احمد خضر شاہ مسعودی کشمیری

بیادگار
محدث عصر حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ

جامعہ امام محمد انور شاہ دیوبند کا
علمی دینی ادبی ترجمان

ماہنامہ

محدث عصر

جلد نمبر ۱۸، شمارہ نمبر ۶، سلسلہ نمبر ۱۸۱

اکتوبر نومبر ۲۰۱۷ء

اشتراک وتعاون

اندرون ملک:
فی شمارہ-/15 سالانہ-/150
خصوصی-/1000
تاحیات-/10000

بیرون ملک:
سالانہ:20امریکی ڈالر
خصوصی:100امریکی ڈالر
تاحیات:500امریکی ڈالر

شائع کردہ

جامعۃ الامام محمد انور شاہ دیوبند

عقب عیدگاہ، دیوبند 247554 (یوپی)
فون آفس: 01336-220471 فون وفیکس (مدیر) 01336-222471-223371
موبائل (مدیر): 08006075484
ای میل: ahmadanzarshah@gmail.com

عصریات

سید احمد خضر شاہ مسعودی کشمیری

پچھلے دو ماہ سے روہنگیائی مسلمانوں پر جس طرح مصائب کے پہاڑ ٹوٹے، ان سے انسانیت کانپ گئی، شرق سے تا غرب، جنوب تا شمال ان آلام پر آج بھی نوحہ کناں ہیں، برمی فوج اور بودھ بھکشوؤں نے ظلم وستم کی وہ خونیں داستان رقم کی کہ اس سے لہورستا رہے گا۔ قتل کا کون سا ایسا طریقہ تھا، جس کی مشق نہیں کی گئی، جانوروں کو بھی اتنی بے رحمی سے مارا نہیں جاتا، جتنی سنگ دلی روہنگیائی مسلمانوں کے لئے روا رکھی گئی۔ انہیں انتہا سے زیادہ گرم تیل میں ڈال دیا گیا، بعضوں کو زندہ جلایا گیا، گڑھے کھود کر باری باری سے ایک ایک بندے کی گردن پر چھریاں پھیری گئیں اور پاؤں کی ٹھوکروں سے نہایت حقارت کے ساتھ گڑھے میں گرادیا گیا، زندہ لوگوں کے ہاتھ پاؤں اس طرح کاٹے گئے کہ لکڑیاں بھی ایسی بے دردی سے کاٹی نہیں جاتیں، ایک ساتھ بڑی بڑی جماعت کو نذر آتش کردیا گیا، ان سانحے کی تصویریں اور ویڈیو آج بھی گردش کررہے ہیں، غیر انسانی حرکتوں کا وہ شرمناک طوفان کہ انہیں دیکھنے کے لئے بھی بے غیرت آنکھیں چاہئیں۔ کشت وخوں کا بازار اس طرح گرم کہ دنیا چیخ پڑی، ۲۰ / ہزار سے زیادہ لوگ انسان نما درندوں کے ہاتھوں تڑپ تڑپ کر مرگئے۔ مکانات اجڑے، وہ الگ۔ بستیاں کی بستیاں خرابات میں تبدیل کردی گئیں، دل شکستہ اور زخم خوردہ ارکانی مظلوموں کے پاس ترکِ وطن کے علاوہ راستہ بھی نہ بچا تھا، لاکھوں کی تعداد میں ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش اور دوسرے ملکوں میں چلے گئے۔ بے سروسامان اور بے آسرا۔ نہ زادِ راہ، نہ محفوظ کارواں۔ بعضے سمندری راستوں سے گئے تو کشتیاں غرقاب ہوگئیں، سارے کے سارے افسردہ اور نیم مردہ۔ دوستوں، عزیزوں اور رشتہ داروں کو کھوئے ہوئے۔ یہ مسلمان جہاں جہاں امدادی کیمپوں میں ہیں، وہاں چلے جایئے! آپ سے ان کی حالت زار دیکھی بھی نہ جاسکے گی۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ ان کے دلوں پر کیا گزر رہی ہے، انہیں قرار کس طرح آرہا ہوگا؟ بعض مسلم حکومتیں اور مسلم تنظیمیں ان کی امداد میں لگی ہوئی ہیں۔ لیکن ان کے مخدوش چہرے، ویران آنکھیں، بدحواس جسم اور ان کی مشکلات ساری کہانی عیاں کررہی ہیں۔ یہ ایک ایسا زخم ہے جسے بھرنے میں صدیاں گزر جائیں گی۔

ان مسلمانوں پر بدترین مظالم پر دنیا بیدار تو ہوئی، مگر سانپ کے میلوں دور نکل جانے کے بعد۔ عالمی دباؤ اور شدید دباؤ کے بعد معاملہ اب قابو میں ہے۔ قابل غور بات یہ کہ غیر انسانی حرکتوں کا یہ طوفان اس خاتون کے عہد حکومت میں بر پا ہوا، جسے اقوام متحدہ نوبل انعام دے چکی ہے۔ آنگ سان سوچی یہ سب دیکھتی رہی اور دہشت گرد اپنا کام انجام دیتے رہے۔ خاموشی اور مکمل خاموشی۔ گویا صاف اشارہ کہ مسلم نسل کشی جاری رہنی چاہیئے۔ سوچی کی اس حرکت پر عالمی برادری سراپا احتجاج بنی، زوردار آوازیں اٹھیں، تب اس نے مہاجرین کو واپسی کی دعوت دی ہے۔ لیکن لٹے پٹے مسلمان اتنے ڈرے، سہمے اور موجِ حوادث کے ایسے مارے کہ انہیں ہمت ہی نہیں ہو رہی۔ جس کے لئے اس کا گھر مقتل بن چکا ہو، ہزار یقین دہانیوں کے باوجود وہاں جاتا کون ہے؟

ادھر ہمارا ملک ہے، کہا یہی جاتا ہے کہ ہمارا دل بڑا ہے، مگر اس کے مظاہرے کم کم ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔ چالیس ہزار سے زیادہ برمی مہاجرین ہندوستان میں ہیں۔ وہ اپنے ملک جانا نہیں چاہتے، مگر حکومت انہیں زبردستی بھیج رہی ہے۔ افسوس تو یہ کہ اس پر بھی سیاست جاری ہے۔ دریدہ دہن سیاست داں زہریلی زبانیں استعمال کر رہے ہیں۔ سوداگرانِ نفرت آگ اگل رہے ہیں، بدزبانی اور پیہم بدزبانی۔ ملکی روایت کے سراسر برخلاف۔ برمی مہاجرین ان کی نظر میں گویا نوعِ انسانی سے ہی خارج ہیں۔ تف ہے ایسی ذہنیت پر۔ ضرورت تھی کہ ان کی اشک شوئی کی جاتی، ان کی ڈھارس بندھائی جاتی، ان کے ساتھ کھڑا ہوا جاتا، ان کے دکھ درد کو سمجھا جاتا، مگر ایسا نہیں ہو رہا، یہ ہندوستانی ضمیر کے خلاف تو ہے ہی، اس کے مزاج سے بھی میل نہیں کھاتا۔

٭٭٭

مسلمانوں کی سخت جانی ملاحظہ ہو، ان کے مسائل گھٹتے تو نہیں، مگر روز بروز بڑھتے ضرور ہیں، جوں جوں زمانہ آگے جا رہا ہے، مسلمانوں کی پریشانیوں میں اضافے ہی اضافے ہیں، ایک سے بڑھ کر ایک۔ تازہ اضافہ ''محرم کے بغیر خواتین کو حج کی مشروط اجازت'' ہے۔ حج کمیٹی نے ۷/ اکتوبر کو اقلیتی امور کے مرکزی وزیر مختار عباس نقوی کو نئی حج پالیسی کے لیے جو چند سفارشات پیش کی ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ ۴۵/ سال سے زیادہ عمر کی خواتین کو چار خواتین کے گروپ میں سفر حج میں جانے کی اجازت دی جائے۔

اس سفارش کے پیش آتے ہی مسلم حلقوں میں ملا جلا ردعمل دیکھنے میں آیا ہے، دہلی جامع مسجد کے امام اور مسلم مجلس مشاورت اس سفارش کو درست باور نہیں کرتی، جب کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی نظر میں اس سے کوئی پریشانی ہی نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ اسلام میں خواتین کو بغیر محرم عام سفر کی بھی اجازت نہیں ہے، پھر فریضۂ حج کی ادائیگی بغیر محرم کیسے ممکن ہو سکتی ہے؟ فقہائے احناف نے صاف کہا ہے کہ

خواتین بغیر محرم سفرِ حج پرنہیں جاسکتیں،خواہ ان کی عمر کوئی ہو۔اس قبیل کی تفصیلات سے کتب حنفیہ بھری پڑی ہیں۔دراصل اس مسئلہ کی بنیاد فتنہ پر ہے،اگر فتنہ سے امن ہوتو فقہاء جواز کی صورت نکالتے ہیں،اگر امن نہ ہوتو مصرّح ہے کہ اجازت نہیں دی جاسکتی اور معلوم ہے کہ دورِ حاضر میں فتنہ کی بنیادیں کس قدر مضبوط اور وسعت پذیر ہوگئیں،خواتین گھروں کی چہاردیواری میں بھی محفوظ نہیں،چہ جائیکہ ان کو نامحرمی کی حالت میں اجازتِ سفر دی جائے۔۲۵/اکتوبر کو حرم مکی کے مفتی پروفیسر دکتور وصی اللہ صاحب ہندوستان کے اورنگ آباد میں تشریف فرما تھے،جب ان سے یہی بات معلوم کی گئی تو انہوں نے علانیہ کہا کہ عورت خواہ کتنی ہی بوڑھی کیوں نہ ہوجائے،سفرِ حج کے لئے محرم لازمی شرط ہے۔انہوں نے اس بات کی بھی تردید کی کہ سعودی حکومت نے بغیر محرم کے سفر کی اجازت دے رکھی ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ کچھ لوگ معاملے کو الجھانے میں ہی لذت محسوس کرتے ہیں،اب دیکھئے!مرکزی وزیر مختار عباس نقوی تو یہ کہہ کر سفارش کو قبول کر گئے کہ دیگر ممالک کی خواتین بھی اس طرح حج کر رہی ہیں،حتی کہ سعودی حکومت نے خود اس کی پہل کی ہے اور دوسری طرف حرم مکی کا بیان حکومتِ ہند کی تردید کر رہا ہے۔حالاں کہ یہ ایسا موضوع نہیں تھا،جسے اٹھایا جاتا۔جو چیز پرسکون طریقے سے ایک عرصہ سے چل رہی ہو،اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ بسا اوقات نقصانِ عظیم کا سبب بن جاتی ہے۔مانا کہ بغیر محرم خواتین کے سفرِ حج کے سلسلے میں فقہاء کا اختلاف ہے،مگر یہ ہندوستان ہے،یہاں حنفی مسلمانوں کی اکثریت ہے،لہٰذا قدیم شق کے ساتھ تعرض نہ کیا جاتا تو کوئی پہاڑ نہ ٹوٹ جاتا۔

اسلام میں مرد کو ''قوام'' کہا گیا ہے،جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ خواتین کا نگراں ہے،محرم کے ساتھ سفر اسی نکتے کے پیشِ نظر ہے،فقہائے احناف نے فتنے سے بچنے کے لئے ہی یہ نقطۂ نظر قائم کیا تھا،حالات دن بدن نازک تر ہوتے جارہے ہیں،فتنے عروج پر ہیں،عزت وعصمت کی حفاظت مشکل ترین ہوگئی،ایسے خطرناک موڑ پر بے محرم خواتین کو حج جیسے عظیم سفر کی اجازت دینا اسلام کے بھی منافی ہے اور عقل کے بھی۔اس لئے حکومت سے گزارش ہے کہ اصلاحات کے لئے دوسری شقوں پر توجہ دے۔کرنے کے کام کی کوئی کمی نہیں ہے۔

✻✻✻

انتخابات کی گہما گہمی ایک بار پھر عروج پر ہے،اگلے دو ماہ کے دوران دو ریاستوں میں انتخابات ہونے ہیں،ہماچل پردیش اور گجرات۔اول الذکر میں ۹/نومبر کو ایک ہی مرحلہ میں حق رائے دہی کا استعمال کیا جائے گا،جب کہ گجرات میں ۲/مرحلوں میں انتخابات ہوں گے۔۹/اور ۱۴/دسمبر رائے

دہندگان اپنے حق رائے دہی کا استعمال کریں گے اور ۱۸/ دسمبر کو دونوں ریاستوں کی رائے شماری ہوگی۔

ہماچل پردیش میں اس وقت کانگریس کی حکومت ہے اور گجرات میں بھاجپا کی۔ اول الذکر ریاست کا نام زیادہ سرخیوں میں نہیں ہے، جب کہ گجرات انتخابات کے چرچے ہر باخبر کی زبان پر ہیں۔

انتخابات کا اعلان ہوا اور سیاسی پارٹیاں تیز گام نہ ہوں، یہ کیسے ممکن ہے؟ چناں چہ اربابِ سیاست دن رات ایک کئے ہوئے ہیں، دوروں پر دورے، نشستوں پر نشستیں، بیانات پر بیانات، کامیابی کے لئے ان کی بے چینیاں صاف دکھائی دے رہی ہیں۔ سفر در سفر، ریلیاں در ریلیاں۔ زبانی نوک جھونک اور ایک دوسرے کی کردارکشی۔ کانگریس اور بی جے پی کی حریفانہ کشاکش پھر جوبن پر ہے، دونوں جماعتیں کیل کانٹے سے لیس دو دو ہاتھ کر رہی ہیں۔ پھر وہی مودی اور راہل گاندھی کے جلوے۔ وزیر اعظم مودی متعدد منصوبوں کے ذریعے رائے دہندگان کو رجھانے میں مصروف ہیں اور راہل گاندھی پے بہ پے الفاظ کی بمباری میں۔ چوں کہ لوک سبھا انتخابات ۲۰۱۹ء میں ہونے ہیں، ان کے پیشِ نظر گجرات انتخابات بڑے اہم ہوگئے ہیں۔ کانگریس کے لئے یہ ریاست ۳۰/ برسوں سے بنجر بنی ہوئی ہے، تاہم مرکزی حکومت کے فیصلوں سے عوام کی پریشانیاں اس کے لئے ہوا کا تازہ جھونکا ثابت ہوئی ہیں۔ ادھر زعفرانی محاذ خوف و دہشت میں مبتلا، ''خود کردہ را علاجے نیست''۔ نوٹ بندی سے نکل کر ''جی ایس ٹی'' کی آفت سے عوام کو اس قدر مشتعل کہ بھاجپا کے پاس نہ جائے رفتن ہے، نہ پائے ماندن، اس کے خلاف نعرے لگ رہے ہیں، جلسے ہو رہے ہیں، احتجاج جاری ہے، سوشل میڈیا میں تلخ و شیریں تبصروں کا بازار گرم ہے، اس پر مستزاد یہ کہ امت شاہ کے بیٹے جے شاہ کی کمپنی کی صبار فتار ترقی نے بھی مخالفین کے لئے کمک کا کام انجام دیا، تازہ مسئلہ یہ کہ پاٹی دار لیڈر کو رشوت دینے کی خبر نے زعفرانی جماعت میں کھلبلی مچادی ہے، ان سارے واقعات نے کانگریس کے حوصلے بلند کردیئے ہیں، چناں چہ راہل گاندھی گرج رہے ہیں اور دھواں دھار تقریروں سے اپنے لئے میدان سازی میں مصروف۔ ادھر بھاجپا شکست سے بچنے کی ہر ممکن کوششوں میں غلطاں۔ ہر مرتبہ کی طرح بی جے پی کی نظریں ایک مرتبہ پھر مودی پر ہیں، بھگوا بریگیڈ وزیر اعظم کے کندھوں پر سوار ہوکر اس الیکشن کو بہر حال جیتنا چاہتا ہے، اس کے لئے ان سے ۵۰/ سے زیادہ ریلیوں کو خطابات کرنے کی درخواست کی ہے۔ ۱۸۲/ سیٹوں پر کامیابی کے لئے زور تو دونوں طرف سے لگایا جارہا ہے، مگر نتیجہ کیا نکلے گا، اس کا پتہ ۱۸/ دسمبر کو چلے گا۔

❊ ❊ ❊

قسط (۵)

ذالک الکتاب

فخر المحدثین حضرت مولانا انظر شاہ کشمیری نوراللہ مرقدہٗ

ولطال ما احدث نفسی ان اصنف فی ھذا الفن کتاباً یحتوی علی صفوۃ مابلغنی من عظماء الصحابۃ وعلماء التابعین ومن دونھم من سلف الصالحین۔

ترجمہ: ایک طویل زمانہ سے میں یہ ارادہ کرتا تھا کہ تفسیر میں کوئی ایسی کتاب لکھوں جو حضرات صحابہ وتابعین کی منتخب چیزوں پر مشتمل ہو اور علمائے صالحین کے بیان کردہ ان نکات کو جو اُن سے منقول ہیں۔

تشریح: **لطال** میں **لام** قسمیہ ہے اور **ما** مصدر یہ، یہی وجہ ہے کہ بیضاوی کے عام نسخوں میں اسے فعل سے جدا لکھا گیا ہے، بعض شارحین کہتے ہیں کہ یہ **ما** کافہ ہے، لیکن یہ خیال صحیح نہیں، اگر کافہ ہوتا تو فعل سے متصل لکھا جاتا، جیسا کہ **انما** کو متصل لکھا جاتا ہے، **طال ماخوذ من الطِوال** دراز ہونا، لمبا ہونا۔ **اطالۃ وتطویل** لمبا کردینا۔

تطاول ظلم کرنا، دست درازی کرنا۔ **احدث** متکلم کا صیغہ **من التحدیث** بیان کرنا، **محدث** بیان کرنے والا جمع **محدثون**، **حدیث نفس** خیالات، حدیث میں یہ لفظ آیا ہے، جس کی شارحین نے مناسب تشریح کی ہے، **الصفوۃ** تینوں اعراب کے ساتھ اس کا استعمال ہے، یعنی بضم الصاد والفتح والکسر بمعنی خلاصہ، خالص، منتخب، **عظماء** جمع **عظیم** باب کرم **عظمۃ** مصدر ہے، بڑا ہونا۔ تعظیم کسی کا احترام کرنا، نیز ایک جمع **عظام** بھی استعمال ہوتی ہے۔

صحابۃ جمع **صحابی**، یہ لفظ اب خاص ہوگیا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے لیے، "**والمشھور فی تعریفہ عند المحدثین الصحابی ھو مومن رای النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم ومات علی الایمان**"، اور بعض محدثین طویل صحبت کی بھی قید لگاتے ہیں اور روایت حدیث کی بھی، لیکن جمہور محدثین کا مسلک وہی ہے جو اوپر ذکر کیا گیا، تابعین کے لیے بھی یہ شرط نہیں کہ وہ صحابہ سے روایت کریں؛ بلکہ ان کے لیے کسی صحابی کی زیارت تابعی ہونے کے لیے کافی ہے، یہی وجہ ہے کہ مخالف حلقہ نے بھی امام ابوحنیفہؒ کو تابعی تسلیم کیا ہے، درآں حالیکہ ان کی روایت کسی صحابی سے ان کے خیال میں ثابت

نہیں، کما کتب الشیخ عبدالحی الکھنوی فی تصنیفہ "اقامۃ الحجۃ علی ان الاکثار فی العبادۃ لیس ببدعۃ" واتی بتحقیق انیق موید اباقوال المخاصمین۔

قاضی کے پیش نظر عظمائے صحابہ سے مراد حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن مسعودؓ، ابی ابن کعبؓ وزید بن ثابت رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں، جن سے تفسیری اقوال زیادہ تر منقول ہیں اور حضرت علیؓ ان میں سب سے زیادہ ممتاز ہیں، تا آں کہ حَبر الامۃ حضرت ابن عباسؓ نے بھی علوم قرآنی میں ان کی مہارت کو تسلیم کیا؛ بلکہ ابن عباسؓ نے تو یہ بھی فرمایا کہ میں جو کچھ قرآن کی تفسیر کے بارے میں کہتا ہوں وہ حضرت علیؓ ہی سے منقول ہے۔

تابعین جمع تابع کی، اصطلاح میں رجل مؤمن صحب الصحابی لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

مصنف کے پیش نظر علمائے تابعین سے مراد اولاً حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ ہیں، جن کی ملاقات تقریباً سو صحابہ سے ثابت ہے، اور تلمیذ ابن عباس حضرتِ مجاہد، جنہوں نے حضرت ابن عباس سے مکمل قرآن کے علوم حاصل کیے، پھر سعید بن جبیر القتیل من ید سفاك ھذہ الامۃ حجاج ابن یوسف مزبورہ فی کتب التاریخ. ابن جبیر نے ابن عباس، ابن عمرو، ابن زبیر رضوان اللہ علیہم اجمعین سے علم قرآن حاصل کیا، ان کے بعد عبدالرزاق وابوعلی فارسی وعلی ابن ابوطلحہ ہیں، پھر اس کے بعد مفسرین کا ایک لمبا چوڑا سلسلہ ہے، جنہوں نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق قرآن مجید کی تفاسیر لکھی ہیں، بعض تو وہ اساسی شخصیتیں گذری ہیں، جن کے کمالات کو ایک دنیا نے تسلیم کیا، مثلاً اعجاز قرآن جو قرآن کا لاینحل مسئلہ ہے، اس فن کی دو عمادی شخصیتوں سے متعلق کائناتِ علم نے تسلیم کیا کہ لم یدر اعجاز القرآن الا الاعرجان احدھما من زمخشر وثانیھما من جرجان. مراد عبدالقاہر جرجانی وجاراللہ زمخشری ہیں، جو اتفاقاً دونوں لنگڑے تھے، فخر رازی جن کی غیر معمولی مہارت ودستگاہ کو مولانا روم نے تسلیم کرتے ہوئے اعتراف کیا ؎

گر باستدلال کار دیں بود
فخر رازی راز دار دیں بود

رحمھم اللہ فانھم بذلوا انفوسھم فی خدمۃ القرآن شکر اللہ مساعیھم۔

احتوائے، شامل ہونا مشتمل ہونا۔

سلف گذری ہوئی شخصیتیں جمع اسلاف، صالحین جمع صالح نیکوکار، والفرق بین الصدیقین

والشھداء والصالحین دقیق سنکتب ان شاء اللہ تحت تفسیر آیۃ "انعمت علیھم"۔

وینطوی علی نکت بارعۃ ولطائف رائقۃ استنبطتھا انا ومن قبلی من افاضل المتاخرین واماثل المحققین ویعرب عن وجوہ القرأت المشھورۃ المعزیۃ الی الائمۃ الثمانیۃ المشھورین والشواذ المرویۃ عن القراء المعتبرین۔

ترجمہ: اور یہ تفسیر مشتمل ہو دل پذیر نکات اور دل پسند لطائف پر جن کو میں نے خود قرآن سے حاصل کیا اور مجھ سے پہلے فضلاء وعلماء نے۔ اور اپنی اس تفسیر میں ان مشہور قرأتوں کا بھی بیان کروں جو آٹھوں مشہور قراء کی جانب منسوب ہیں؛ بلکہ ان شاذ قرأتوں کا بھی ذکر کیا جائے جو نادر ہونے کے باوجود معتبر قاریوں سے منقول ہیں۔

تشریح: انطوائ مشتمل ہونا، نکت جمع نکتۃ باریک چیز کوئی علمی لطیفہ ودقیقہ، برع من باب فتح روشن ومنور لطائف جمع لطیفۃ۔ رائقۃ ماخوذ من الروق من نصر، منور ہونا، روشن ہونا، نبط چھوٹنا استنباط کسی چیز کو توڑ کر نکال لینا، حاصل کرنا، مطلع ہونا، افاضل جمع افضل۔ اماثل جمع امثل بمعنی منتخب، قرآن مجید کی آٹھ قرأتیں جن کا تذکرہ قاضی صاحب نے کیا ہے، ان کی تفصیل عنقریب سورۂ فاتحہ میں پیش کی جائے گی۔

الا ان قصور بضاعتی یثبطنی عن الاقدام ویمنعنی عن الانتصاب فی ھذا المقام حتی سنح لی بعد الاستخارۃ ما صمم بہ عزمی علی الشروع فیما اردتہ والاتیان بما قصدتہ ناویا ان اسمیہ بعد ان تممہ بانوار التنزیل واسرار التاویل فھا انا الآن اشرع بحسن توفیقہ اقول وھو الموفق لکل خیر والمعطی لکل سؤل۔

ترجمہ: لیکن میں تفسیر کے ارادہ سے اپنی کمئ علم کی بنا پر رکتا رہا اور اس اہم کام کی ذمہ داریاں مجھے اس عظیم مہم میں داخل ہونے سے روکتی رہیں، لیکن مسنون استخارہ کے بعد تفسیر کا ارادہ مصمم ہو گیا اور تہیہ کر لیا کہ اپنے منصوبے کے مطابق تفسیر شروع کرنا ہے؛ بلکہ میں نے اس کا نام بھی تجویز کر لیا، انوار التنزیل واسرار التاویل۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ یہ نام کتاب کے مکمل ہونے کے بعد شہرت پذیر ہوگا۔ تو لیجئے اب میں تفسیر شروع کر رہا ہوں اور ان دشوار گذار مرحلوں میں خدائے تعالیٰ سے نیک توفیق طلب کرتا ہوں کیوں کہ ہر چیز کی توفیق دینے والے اور ہر سائل کے سوال کو وہی پورا کرنے والے ہیں۔

تشریح: **قصور** من نصر رکنا، **بضاعت** سرمایہ، پونجی، ب، ض، ع کے مادہ میں خواہ وہ کسی ترتیب سے جمع ہوں، کٹنے کا مفہوم موجد ہے، **بعض** کل کا وہ حصہ جو کاٹ کر علیحدہ کیا گیا ہو **بعوض** پسو اس لیے

کاٹتا ہے۔عضب شمشیر براں بضاعة وہ سرمایہ جو انسان نے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر جمع کیا ہو، یہاں مراد سرمایۂ علم ہے،ثبط رکنا، روکنا سنح من فتح ظاہر ہونا۔استخارہ باب استفعال طلب خیر کرنا۔خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اہم امور میں جب بندہ کرنے و نہ کرنے کی تعیین سے عاجز ہو، استخارہ کا حکم دیا ہے،اس کے بہت سے طریقے علماء وصوفیاء سے منقول ہیں،جن کی تفصیل متعلقہ کتب میں دیکھی جا سکتی ہے، استخارہ کوئی حجت شرعی نہیں ہے،اطمینانِ قلب کا ایک ذریعہ ہے اوراس میں شک نہیں کہ اس کے نتائج عموماً بارآور ہوتے ہیں۔صمم مضبوط ہونا ومنه الاصم بہرا۔کانوں کا ٹھوس ہوجانا کہ آواز کی لہریں اندر داخل نہ ہوسکیں صمصام تلوار عزم مضبوط ارادہ واعلم ان ههنا ترتيب فالاول الارادة والثاني القصد الثالث العزم ولذا قال الله تعالىٰ فاذا عزمت فتوكل على الله. تسمیہ نام رکھنا،تتمیم مکمل کرنا توفیق کسی نیک مقصد کے لیے مطلوب وسائل واسباب کا مہیا کرنا،وهذا شانه تعالىٰ لانه يوجد الاسباب الخير لامر الخير وهو يليق ان يسمى بالموفق وتم توضيح المقدمة في يوم الاثنين في اول يوم من شهر رمضان في بلد ببنغلور من بلاد جنوب هند فالحمد لله على ذالك۔

سورۂ فاتحہ

الكتاب وتسمى ام القرآن لانها مفتحه ومبدأه فكانها اصله ومنشأه ولذالك تسمى اساسا او لانها تشتمل على ما فيه من الثناء على الله عز وجل والتعبد بامره ونهيه وبيان وعده ووعيده۔

ترجمہ:سورۃ فاتحۃ الکتاب کا ایک نام ام القرآن بھی ہے،چوں کہ یہ قرآن کے آغاز میں ہے اور ابتدائی چیز اصل وبنیاد کی حیثیت رکھتی ہے،یہیں وجہ ہے کہ اس کا نام اساس (بنیاد) بھی ہے یا اس وجہ سے کہ یہ سورۃ اللہ بزرگ وبرتر کی تعریف پر مشتمل ہے اوراس میں خدائے تعالیٰ کے اوامر کی تعمیل اور منہیات سے پرہیز کرنے کا حکم ہے،اس میں منجانب اللہ (نیکوکاروں کے لیے) بہترین وعدے ہیں اور (بدکاروں کے لیے) عذاب کی دھمکیاں ہیں۔

تشریح:قرآن مجید کی وہ سورتیں جو یکبارگی نازل کی گئیں،ان میں سورہ فاتحہ پہلی سورت ہے، جسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل نازل کیا گیا،یہ وہ اہم سورت ہے جس کے بارے میں مفسرین کی رائے ہے کہ اس کا دوبار آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول ہوا،ایک مرتبہ مکہ معظّمہ میں اور دوبارہ تحویل قبلہ کے بعد مدینہ منورہ میں،سورۂ فاتحہ کے بہت سے نام ہیں،جن میں سے بیشتر خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ

وسلم سے منقول ہیں، ناموں کا یہ تعدّد اس سورت کی عظمت کو واشگاف کرتا ہے، جس طرح خدا تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں، یا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کثیر اسماء ہیں اور یہ کثیر اسماء خدا تعالیٰ اور اس کے رسول کی اہم صفات وخصوصیات کے مظہر ہیں، اسی طرح فاتحہ کے متعدد نام اس سورت کے اہم گوشوں کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔

راقم الحروف پہلے سورۂ فاتحہ کے اسماء سے متعلق کچھ تفصیل عرض کرتا ہے، چوں کہ قرآن مجید کے آغاز میں آج کے موجودہ قرآنی نسخہ کے پیش نظر سب سے پہلی سورت جس پر قرآن کو کھولتے ہی نظر پڑتی ہے یہی سورت ہے، اس لیے اس کا ایک نام فاتحہ ہے، نیز اسے فاتحہ اس وجہ سے بھی کہتے ہیں کہ نمازوں کا افتتاح اسی سورت سے ہوتا ہے، جمہور علماء اسے "ام الکتاب" کہتے ہیں، چوں کہ قرآن مجید کے تمام مضامین جو تیس پاروں میں منتشر ومفصل زیر بحث آئے وہ سورۂ فاتحہ میں بالاجمال موجود ہیں، جیسا کہ درخت کی حقیقت اس کی جڑ میں موجود ہوتی ہے، عربی میں امٌّ بمعنی اصل بھی استعمال ہے، لیکن تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ حسن بصریؒ وابن سیرینؒ سورۂ فاتحہ کے لیے "ام القرآن" کا نام مناسب نہیں سمجھتے، ان کا خیال ہے کہ "ام الکتاب" لوح محفوظ کا نام ہے یا قرآن کی خود تصریح کے مطابق متشابہات ومحکمات کا نام ہے، جیسا کہ خدا تعالیٰ نے محکمات کے ذکر کے بعد فرمایا "هن ام الکتاب" یہ دونوں حضرات سمجھتے ہیں کہ اگر ام الکتاب سورۂ فاتحہ کا بھی نام ہوتا تو اشتباہ ہوگا، یہ اس سورت کو "ام القرآن" بھی کہنا پسند نہیں کرتے، حالاں کہ حدیث صحیح جو ترمذی میں ہے اور جسے ترمذی نے صحیح قرار دیا ہے، بروایت حضرت ابو ہریرہؓ سورۂ فاتحہ کے لیے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس نام کے منقول ہونے کے بعد قیل وقال کی کیا گنجائش ہے۔

اس سورت کا نام "الحمد" بھی ہے، اور الصلوٰۃ بھی، الصلوٰۃ اس لیے کہتے ہیں کہ ایک حدیث میں ہے **قسمت الصلوٰۃ بینی وبین عبدی نصفین**، یہاں **الصلوٰۃ** سے مراد یہی سورۃ فاتحہ ہے، غالباً **الصلوٰۃ** اسے اس وجہ سے کہا گیا کہ یہ نماز کی شرائط میں سے ہے، اس کا ایک نام "سورۂ شفاء" بھی ہے، مسند دارمی میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "سورۂ فاتحہ" تمام امراضِ ظاہری وباطنی کے لیے شفاء ہے، بجز موت کے، کہ اس کا کوئی علاج نہیں، ایک نام اس کا "الرقیہ" بھی ہے، جس کے معنی "منتر" کے آتے ہیں، یہ نام بھی خود نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے، **کافیہ** بھی اس کا نام ہے اور اساس القرآن بھی **وافیہ** اور سورۂ کنز بھی اس کا نام ہے، زمخشری نے کشاف میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔

عام طور پر اسے مکی سمجھا جاتا ہے، ابن عباسؓ، قتادہؓ وابو العالیہؒ کی رائے یہی ہے، لیکن

ابو ہریرہؓ، مجاہد، عطاء بن یسار اور زہری اسے مدنی قرار دیتے ہیں، جب کہ ایک قول وہ بھی ہے جس کا سطورِ بالا میں ذکر گذرا یعنی مکہ و مدینہ میں اس کا نزول ہوا، ابو اللیث سمرقندی کی رائے ہے کہ اس سورت کا نصف مکہ میں نازل ہوا اور نصف مدینہ میں، ان کی رائے قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں نقل کی ہے، حالاں کہ یہ بات غلط ہے، ابھی احقر نے لکھا تھا کہ یہ قرآن مجید کی وہ پہلی سورت ہے جس کا مکمل نزول یکبارگی آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوا۔

سورۂ فاتحہ کی سات آیتیں ہیں، یہی مشہور و متفق علیہ قول ہے، اگر چہ عمر بن عبید نے آٹھ آیتیں قرار دی ہیں اور حسین جعفی کل چھ ہی کہتے ہیں، یہ دونوں قول نہ صرف ناپسندیدہ؛ بلکہ متروک ہیں۔

اس سورت کے پچیس (۲۵) کلمات اور ایک سو تیرہ (۱۱۳) حروف ہیں۔

اس سورت سے متعلق بہت سی ایسی روایتیں ہیں، جن سے اس کی عظمت نمایاں ہوتی ہے، مثلاً مسند امام احمد بن حنبلؒ میں ہے کہ ابوسعید بن معلیٰ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نماز میں مشغول تھا، آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یاد فرمایا، لیکن میں نماز کی بنا پر حاضر خدمت نہیں ہو سکا، حاضری پر آپ نے فوراً عدم حاضری کی وجہ دریافت کی، میں نے نماز کا عذر پیش کیا، اس پر آپ نے فرمایا کہ کیا تم نے قرآن مجید کا یہ ارشاد نہیں سنا "یاایھا الذین اٰمنوا استجیبوا للّٰہ والرسول اذا دعاکم لما یحیبکم" کہ اے مومنو! خدا اور اس کا رسول جب تمہیں حیات آفریں کسی کام کی جانب بلائے تو ان کے بلانے پر لبیک کہو، پھر آپ نے فرمایا کہ "میں تمہیں مسجد سے جانے سے پہلے قرآن کی ایک عظیم سورت کی نشان دہی کروں گا، آپ نے پھر میرا ہاتھ اپنے دست مبارک میں لیا اور مسجد سے باہر چلے، تو میں نے یاد دلایا کہ وہ عظیم سورت کیا ہے، جس کے بتانے کا آپ نے وعدہ فرمایا تھا، ارشاد فرمایا کہ "ہاں وہ سورۂ فاتحہ ہے، جو خدا نے مجھ پر نازل فرمائی"، یہ روایت بخاری و ابوداؤد میں ہے، نسائی و ابن ماجہ نے بھی اس کی روایت کی ہے، مسلم میں ایک روایت اور موجود ہے، راوی حضرت ابن عباسؓ ہیں کہ "آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حضرت جبرئیلؑ حاضر تھے کہ اچانک بجانبِ آسمان دروازہ کھلنے کی آواز آئی، حضرت جبرئیلؑ نے اپنا سر اٹھایا اور کچھ دیکھ کر فرمایا کہ آج آسمان کا ایک ایسا باب کھولا گیا ہے، جو اس سے پہلے کبھی نہیں کھولا گیا تھا، اتنے میں ایک فرشتہ اتر کر آیا اور آں حضور سے عرض گذار ہوا کہ مبارک ہو! دو نور آپ کو عنایت کیے گئے ہیں، جو آپ سے پہلے کسی نبی و پیغمبر کو نہیں دیے گئے تھے، یعنی سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی آخری آیتیں، خدا تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ ان کے پڑھنے والے کو وہی چیز عنایت کروں گا، جو وہ

طلب کرتا ہے، یہ روایت نسائی میں بھی ہے،غرض کہ اس سورت کے فضائل میں بہت سی روایات ہیں، جن سے اس سورت کی فضیلت ورفعت واضح ہے۔

راقم الحروف نے بطورِ نمونہ صرف ایک دوروایات کا ذکر کیا ہے۔

قاضی بیضاویؒ: نے لفظ **سورۃ** استعمال کیا ہے یہ **سور البلد** سے لیا گیا ہے، مفسرین کے یہاں سورت کا مطلب کلام کا اس قدر حصہ ہے جس کا خود کوئی نام ہو اور جس میں کم از کم تین آیات ضرور ہونی چاہئیں، اگر یہ **سور البلد** سے لیا گیا تو پھر مناسبت یہ ہے کہ فصیلِ شہر، اندرون شہر ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہوتی ہے، اسی طرح سورۃ ان تمام مضامین ومطالب پر حاوی ہوتی ہے جو اس سورت میں موجود ہیں، **سورت** کی اضافت **فاتحہ** کی جانب اضافت لامیہ ہے، اس لیے کہ اضافت کی بھی تین قسمیں ہیں: ایک اضافت **لام** کی تقدیر کے ساتھ، دوسری فی کی تقدیر کے ساتھ اور تیسری بتقدیر من، پہلی کی مثال **غلام زید** دوسری کی **صلوۃ اللیل** تیسری کی **خاتم فضۃ** ہے۔

سورہ فاتحہ میں اضافت بتقدیر لام ہے، فاتحہ پر تاء نقل کی ہے، صفت کے صیغہ کو جب اسمیت کی طرف منتقل کیا جاتا ہے تو اس میں ''تاء'' کا اضافہ کردیا جاتا ہے۔

وعد اور **وعید** میں فرق یہ ہے کہ وعد کا استعمال مواقع خیر میں ہوتا ہے اور وعید شر کے لیے مستعمل ہے، قاضی صاحب نے جن چار چیزوں کا تذکرہ کیا، ان کی اہمیت اس طرح ظاہر ہے کہ نزول قرآن کا مقصد مبداء ومعاد کی معرفت اور اپنے معاد کو درست کرنے کی فکر ہے، ثناء خدا تعالیٰ کی عبادت، مامورات ومنہیات سے مبداء کا علم ہوتا ہے، اور وعد و وعید معاد سے آشنائی کا ذریعہ ہے۔

سورۂ فاتحہ میں **الحمد** سے **یوم الدین** تک خدا تعالیٰ کی حمد وثنا ہے اور **ایاك نعبد** میں خدا تعالیٰ کے اوامر پر عمل کرنے اور منہیات سے خود کو محفوظ رکھنے کا اعلان ہے **انعمت علیھم** میں وعدہ کا پہلو نمایاں ہے اور **غیر المغضوب علیھم والا الضالین** کا لہجہ وعید کا ہے، اور یہی قرآن مجید کے مضامین ومطالب ہیں، جب سورۂ فاتحہ میں ان مطالب کی جانب اشارہ ہے تو اسے کل قرآن کے مطالب پر حاوی سمجھنا چاہیے، اس حقیقت کے پیش نظر سورۂ فاتحہ کے اسماء میں ام القرآن کا بھی تذکرہ بہت برجستہ ہے، بچے اپنی پریشانیوں میں ایک ہی پر شفقت ہستی کی جانب متوجہ ہوتے ہیں اور وہ ماں ہے، اسی طرح ماں کی شخصیت میں مرجعیت اگر چہ اپنی اولاد ہی کے لیے ہے، تو تمام مضامین قرآن سورۂ فاتحہ کی جانب لوٹ رہے ہیں اور اس بنا پر اس کا نام ام القرآن انسب ہے۔

آخری قسط

سائنس فلسفہ اور مذہب

حضرت مولانا شمس الحق صاحب افغانیؒ

علم کیمیا

جابر بن حیان علم کیمیا کا بابا آدم سمجھا جاتا ہے، علم کیمیا پر اس نے سو کتابیں لکھی ہیں۔ اس کی کتاب الکیمیا کے لاطینی اور فرانسیسی میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ مسٹر او ہو دلس نے جابر کی نو کتابوں کا ترجمہ کیا۔ علم اور قوت میں تلازم ہے، جس قوم میں علم ہو وہ طاقت ور ہوتی ہے، اور جس قوم نے علم میں غفلت برتی وہ ذلیل ہو جاتی ہے۔ علم اور سائنس کی روشنی دنیا میں مسلمانوں سے پھیلی، جب کہ دنیا کی دیگر قومیں غیر مہذب اور جاہل تھیں۔ بالخصوص یورپی اقوام لیکن آج اس کے خلاف مسلمان علم اور سائنس سے دور ہیں اور دیگر اقوام بام ترقی پر پہنچ گئی ہیں۔ انہوں نے لوہے کو استعمال کر کے وہ قوت حاصل کی جس کی نظیر نہیں ملتی۔ مسلمان قوت سے بھی محروم ہیں اور لوہے کے استعمال سے بھی، اس لیے اب ہم مسلمانوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ لوہے اور قوت کی اہمیت اسلام میں کیا ہے؟

لوہے اور قوت کی اہمیت اسلام کی نظر میں

مذاہب عالم میں صرف اسلام کو جو دین فطرت ہے، یہ خصوصیت حاصل ہے کہ وہ دین و دنیا کا جامع اور قوت و قانون دونوں کا حامل ہے۔ شنومت جو جاپان کی اکثریت کا مذہب ہے۔ نہ اس میں دنیوی زندگی کے لیے کوئی جامع قانون موجود ہے اور نہ قوت، اور نہ لوہے سے تیار کردہ آلات حرب کی طرف کوئی ترغیب پائی جاتی ہے۔ اس کا سارا زور نفس کشی، چلہ کشی اور دنیا بیزاری پر صرف ہوا ہے بلکہ اس میں حیات کو دکھ اور موت کو سکھ ثابت کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ یہی حال کنفیشوس ازم کا ہے۔ جو چین کی اکثریت کا مذہب ہے۔ نہ اس میں کوئی ضابطۂ حیات ہے اور نہ جامع قانون۔ زندگی ترک کر دینا اور تجرد کی درویشانہ زندگی اس مذہب کی روح ہے۔ اسی طرح بدھ مذہب جس میں دھیان گیان کے سوا اور دنیا بیزاری کے سوا کچھ نہیں۔ مسیحیت کی اصلی بنیاد عجز، خاکساری، تجرد، ترک دنیا اور ظالم سے چشم پوشی اور ترک مقابلہ پر مبنی ہے۔ انجیل میں ایک

گال پر تھپڑ لگانے والے کے آگے دوسرے گال کو پیش کرنے کی تعلیم موجود ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ ان چار بڑے عالمی مذاہب میں نہ جامع قانونِ حیات موجود ہے نہ قوت کی تحصیل کی ترغیب پائی جاتی ہے۔ بلکہ یہ مذاہب ضعف کی حوصلہ افزائی کے حامل ہیں۔ اسلام چونکہ دین، فطرت ہے اور جامع قانون حیات کا علمبردار ہے، اس لیے اسلام نے قوت کے صلی چشمے (لوہے) کی طرف بھی مسلمانوں کو توجہ دلائی اور فراہمی اسباب قوت کی فرضیت سے بھی ان کو آگاہ کیا۔ سرچشمۂ قوت یعنی لوہے کی اہمیت کے متعلق قرآن میں لوہے کے نام سے ایک خاص سورت موجود ہے، کیوں کہ قرآن میں یہ قاعدہ ہے کہ جس سورت میں متعدد مضامین ہوتے ہیں تو ان سب میں جو مضمون زیادہ اہم ہو۔ اس کے نام پر سورت کو معنون کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید کے ستائیسویں پارہ میں ایک سورت کا نام حدید ہے حدید لوہے کا نام ہے یعنی لوہے کے ذکر پر مشتمل سورت ہے پوری آیت یہ ہے:

ولقد رسلنا رسلنا بالبينات وانزلنا عليهم الكتاب والميزان ليقوم الناس بالقسط وانزلنا الحديد فيه باس شديد ومنافع للناس وليعلم الله من ينصره ورسله بالغيب ان الله قوى عزيز۔

ارشاد ہے کہ ہم نے واضح دلائل کے ساتھ رسولوں کو بھیجا اور ان کے ساتھ آسمانی کتاب اتاری اور انصاف کا ترازو (شریعت) بھی نازل کیا تا کہ تمام اقوام انصاف پر قائم رہیں اور ہم نے لوہے کو اتارا جس میں ہولناک جنگ کا پورا سامان موجود ہے اور تمام اقوام کے لیے دیگر فائدہ مند سامان بھی موجود ہے اور یہ سب سامان اس لیے کیا کہ اللہ دیکھ لیں کہ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عادلانہ قانون کی امداد بن دیکھے کون کرتا ہے، بیشک تمہارا خداوند تعالیٰ قوی اور غالب ہے۔ اس آیت میں پہلے تمام رسولوں اور پیغمبروں کی رسالت الٰہی کا مقصد بیان کیا ہے کہ وہ کتاب الٰہی اور، شریعت ربانی کا نزول ہے، جس سے کرۂ ارض اور اقوام عالم کے لیے عالمی انصاف کا ایسا ایک معنوی ترازو پیش کیا گیا ہے کہ جو فعل و عمل اس ترازو پر درست ہو وہ عالمی انصاف کے مطابق ہے اور جس میں ذاتی یا قومی یا نسلی تفاوت اور کمی بیشی موجود ہو وہ ظالم ہے اور عالمی انصاف کے خلاف ہے، کیوں کہ اس ترازو کا اتارنے والا رب العالمین ہے۔ صرف رب المسلمین یا رب الاورپین یا رب الایشائین یا رب الامریکین نہیں۔ یہ ترازو شریعت آسمانی عالمی انصاف کا ربانی قانون ہے اور قانون انصاف پر جب تک عمل نہ ہو اور عالم میں وہ جاری نہ ہو اس وقت تک انصاف ناممکن ہے۔ اس لیے عالمی انصاف کے لیے قانون عدل وامن کے ساتھ قوت کی بھی ضرورت ہے، اس لیے قرآن نے اعلان کیا کہ قانون انصاف کے لیے کہ تمام انسانوں اور اقوام عالم کو اسی عالمی انصاف کے

قانون پر قائم کیا جائے اور اس کے آگے گردن نہاد ہونے کے لیے ان کو مجبور کیا جائے۔ اس قانون عدل کے لیے ضروری ہے کہ خداوند قدوس سے پیدا کردہ سرچشمۂ قوت سے یعنی لوہے سے استفادہ کیا جائے۔ اس لیے قرآن نے اعلان کیا کہ ہم نے لوہے کو پیدا کیا کہ اس میں فوجی اور سول دونوں قسم کے فوائد موجود ہیں۔ تمام آلات حرب رائفل سے لے کر ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم تک بنانے میں لوہے کی ضرورت ہے اور تمام بری بحری اور ہوائی آلات جنگ کی تخلیق لوہے سے وابستہ ہے جس سے فوجی قوت اور اقامتِ عدل میں مدد ملتی ہے، اسی طرح سامان جنگ کے دیگر مواد بارود وغیرہ خدا نے زمین میں پیدا کیے ہیں، فوجی قوت کے ساتھ سول ضروریات کی فراہمی بھی ضروری ہے۔ وہ بھی لوہے سے وابستہ ہیں۔ ہسپتالوں میں آپریشن وغیرہ کے اوزار کاٹنے کے لیے چھری، چاقو، مصنوعات کے جوڑنے کے لیے میخ وغیرہ قفل، زنجیر، گھڑیاں، چھری، کانٹے، برتن، ظروف اوزار، تعمیر مکان اور ریلوے لائن کے گاڈر اور ریل کی گاڑی موٹر ٹرک کے اجزا بجلی کے تار وغیرہ لوہے کے وجود سے وابستہ ہیں۔ جس کی طرف منافع للناس کہہ کر ترغیب دلائی گئی اور سامانِ جنگ کے بنانے کے لیے فیه باس شدید کہہ کر بتایا کہ لوہے سے جنگ کا خطرناک سامان بنایا جا سکتا ہے۔

مسلمانوں کو بالخصوص لوہے کی فوجی اور سول ضروریات کی فراہمی کی اہمیت کی طرف متوجہ کر دیا گیا۔ اس سے آگے چل کر مذکورہ آیت میں لوہے کے اسلحہ وساز وسامان کے استعمال کا صحیح محل بھی متعین کیا، تاکہ یہ سامان ظلم میں استعمال نہ ہو، عدل اور انصاف عالمی اور انسانی حقوق اور خدائی حقوق کے تحفظ کے لیے استعمال ہو، کیوں کہ سرکاری سامان سرکاری کام میں استعمال ہونا چاہیے، ذاتی مقاصد میں استعمال نہ ہونا چاہیے: لیعلم الله من ینصره ورسله بالغیب تاکہ اللہ تعالیٰ دیکھ لیں کہ ان آلات کو بن دیکھے اللہ اور رسولوں کے قانون عدل میں کون استعمال کرتا ہے اور ان لوہے کے آلات سے کون خدا ورسول کے منشاء عدل کو امداد کرتا ہے اور کون اللہ کے منشاء نصاف کے خلاف ان کو استعمال کرتا ہے۔ یعنی ان آلات سرکاری کا استعمال بڑے سرکار خدا کے کام کے لیے ہونا چاہیے، نہ کہ اس کے خلاف یعنی ان کے استعمال سے عدل قائم نہ ہو۔ نہ ظلم تحفظ حقوق انسانی ہو۔ نہ اتلاف و بربادی حقوق انسانی اسی ایک نکتہ سے جنگ عمومی اور جنگ مقدس یعنی جہاد کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ جنگ عمومی فساد وتخریب ہے اور جہاد میں علمی اصلاح اور تعمیر ہے بقول اقبال مرحوم ؎

جنگ شاہانِ جہاں غارت گری است

جنگ مومن سنت پیغمبری صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم است

اس کی مثال ایسی ہے کہ ڈاکو بھی ہاتھ کاٹتا ہے اور ہسپتال میں ڈاکٹر بھی آپریشن کے ذریعہ ہاتھ کاٹتا ہے، پہلا جنگ عمومی کی طرح تخریبی عمل ہے اور دوسرے جہاد کی طرح اصلاحی عمل ہے۔ پہلا عمل دکھ پہنچانے کے لیے ہے اور دوسرا عمل دکھ ہٹانے کے لیے ہے۔ اسی طرح جب کچھ عالمی عناصر ڈاکو کی طرح راہ عدل وانصاف میں حائل ہو کر روڑے اٹکاتے ہیں تو اسلام لوہے کے اوزار استعمال کرنے اور جہاد کا حکم دیتا ہے یہ عمل صورتاً ایک جیسا ہے۔ نتائج وآثار اور مقصد کے اعتبار سے دونوں میں فرق ہے۔ آیت کے اخیر میں ان اللہ قوی عزیز کہہ کر اقوام عالم کو تنبیہ کی گئی کہ اگر لوہے و دیگر ذخائر الٰہی سے تم نے آلاتِ جنگ تیار کر کے اس کو خالق کائنات کے منشاء کے خلاف استعمال کیا، تو تم آزاد نہیں ہو۔ خالق عالم کے ید قوت کے نیچے ہو اور وہ خالق سب سے قوی اور سب پر غالب ہے۔ تم کو اس ظالمانہ استعمال کی سزا دے گا۔ کہ تم نے خداوند کریم کے سرکاری سامان کو اس کے منشاء کے خلاف کیوں استعمال کیا؟ ہم نے گذشتہ دو جنگوں میں دیکھ لیا کہ ان آلات کے بے جا استعمال سے خود موجدین آلات کی جانوں، اموال وعمارات کو تباہ کر دیا گیا اور باقی لوگ بحیثیت مجموعی امن رہے۔ اب تیسری جنگ کا انتظار ہے جس سے ان ظالموں اور ان کی مددگاروں اور ان کی خدا بیزاری اور مادہ پرستوں کی بڑی تعداد تباہ ہو کر راکھ ہو جائے گی اور باقی ماندہ انسانوں کا مستقبل بھی صدیوں تک تاریک گڑھے میں پڑ جائے گا۔

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ابن آدم (انسان) مجھ کو جھٹلاتا ہے اور یہ بات اس کے شایان شان نہیں اور میرے بارے میں بدگوئی کرتا ہے حالانکہ یہ اس کو مناسب نہیں ہے، اس کا مجھ کو جھٹلانا تو یہ ہے کہ وہ کہتا ہے جس طرح اللہ نے مجھ کو (اس دنیا میں) پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے اسی طرح وہ (آخرت میں) مجھ کو دوبارہ ہرگز پیدا نہیں کر سکتا ہے، حالانکہ دوبارہ پیدا کرنا پہلی مرتبہ پیدا کرنے کے مقابلہ میں مشکل نہیں ہے، اور اس کا میرے بارے میں بدگوئی کرنا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے، اللہ نے اپنا بیٹا بنایا ہے حالانکہ میں تنہا اور بے نیاز ہوں، نہ میں نے کسی کو جنا ہے اور نہ مجھ کو کسی نے جنا اور اور نہ کوئی میرا ہمسر ہے'' اور ابن عباس کی روایت میں اس طرح ہے'' اور اس (انسان) کا مجھے برا بھلا کہنا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ اللہ کا بیٹا ہے حالانکہ میں اس سے پاک ہوں کہ کسی کو بیوی یا بیٹا بناؤں۔ (بخاری)

قندِ مکرّر

مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ

ایک شعلۂ جوالہ، ایک موجِ رواں اور ایک سعی پیہم ''خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود''

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصرؒ

مولانا حفظ الرحمن صاحبؒ ایک مشہور سیاسی لیڈر، مذہبی عالم، بلند پایہ مصنف، پرجوش، مگر سمجھدار مقرر کی حیثیت سے عام طور پر روشناس ہیں، مگر میں سمجھتا ہوں کہ ایسے حضرات ملک وقوم میں اور بھی بہت سے ہیں۔ مولانا حفظ الرحمن کی عظمت میرے قلب میں ان کی سچائی، اخلاص، انتھک محنت، بلندیٔ فطرت، سادگی، سادہ مزاجی، اپنی قوم اور ملک سے ان کی بے لوث محبت اور اس راہ میں ان کی قابل قدر ایثار وقربانی کی وجہ سے ہے۔ مولانا کے اختلاف میں اخلاص کی سچائی ہوتی ہے، خفگی میں محبت کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے، خاموشی میں ہزاروں تقریریں چلتی ہوتی ہیں اور تقریروں میں خاموشیاں کروٹیں بدلتی رہتی ہیں، وہ عام مجامع اور سیاسی میٹنگوں میں بے تکان بولتے ہیں، اتنا بولتے ہیں کہ دوسرے بولنے والوں کا حق بھی چھین لے جاتے ہیں، مگر ذاتی معاملات پر ان کی زبان پر مہر سکوت لگ گئی ہے۔ کبھی اپنی انفرادی زندگی پر کسی دوست احباب سے کچھ نہیں کہتے اور کبھی کسی دوسرے آدمی سے تفریح اور تفنن کے لیے لمبی بات نہیں کرتے۔ سادہ مزاج اور سادہ دل انسان، غصہ آئے تو کوہِ آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑے، خفا ہو تو گھنٹوں سنبھالے نہ سنبھلے، جو بات ہو منہ پر برملا کہے۔ چھوٹوں پر شفیق مگر شفقت ایسی باریک کہ عام نظریں اسے پہچان بھی نہ سکیں۔ دل کو مدت سے اس کی حسرت تھی کہ مولانا کبھی ملیں تو گھل مل کر باتیں کریں، کچھ دیر اپنی کہیں ہماری سنیں۔ مستقبل کے لیے کچھ مشورے دیں اور زندگی کو کارآمد بنانے کے لیے کچھ نصیحتیں بھی ہوں، مگر انہیں نہ پہلے کبھی اس کی فرصت تھی اور نہ آئندہ ہوسکتی ہے، لیکن اس بے تعلقی پر ہزار تعلق قربان اور ان کی اس بیگانگی پر ہزاروں یگانگتیں فدا، بظاہر بے تعلق اور بر موقع حمایت وامداد کے لیے سب سے پیش پیش۔ اپنے بڑوں کے سامنے ہمیشہ مؤدب اور ان کی واجبی عزت واحترام میں بلا کے مستقل، مگر سیاسی رائے کا اختلاف، اپنے بڑوں کے سامنے بھی پوری جرأت وہمت سے کرنے کے عادی۔

یہ مضمون نہ ان کی سوانح عمری ہے اور نہ ان کی زندگی کے کسی ایک رخ پر روشنی ڈالنے کے لیے یہ مختصر سی تحریر کفایت کر سکتی ہے۔ ان کی زندگی اور سیرت کے کچھ دھندلے دھندلے سے نقوش ذہن میں ہیں، انہیں کو پیش کرتا ہوں، کوئی بات کہیں کی ہے اور کوئی بات کہیں کی، ظاہر ہے کہ ان متفرق ٹکڑوں سے ان کی زندگی کا کوئی خاکہ سامنے نہیں آسکتا؛ مگر کچھ بھی نہ ہونے سے یہ اتنا سا ہی غنیمت ہے۔

میں اپنی عمر کے چھٹے ساتویں سال سے انہیں جانتا ہوں، یہ ۱۹۲۸ء یا ۲۹ء کی بات ہے، جب وہ ایشیا کی مرکزی درس گاہ دار العلوم دیوبند کے مدرس تھے، دیوبند کے بعد یہ جامعہ ڈابھیل مدرّس کی حیثیت سے کئی سال رہے۔ میں بھی اپنے والد مرحوم کے ساتھ پڑھنے کے بہانے سے اس درس گاہ میں گیا اور رہا، دو سال مولانا کے کمرے کے بالکل قریب رہنے کا اتفاق ہوا۔ چار پانچ سال کا یہ عرصہ جو ڈابھیل میں بسر ہوا، مولانا کی زندگی کا عجب زمانہ تھا، بظاہر سکون کہ مشاغل صرف تعلیم وتدریس وتصنیف وتالیف کے علاوہ اپنے استاذ مرحوم حضرت علامہ کاشمیری مرحوم سے علمی افاضہ واستفادہ تھے، مگر بہ باطن، وہی سیاسی مذاق کی گہرائیاں، ملک کی تباہ حالی کا رنج، قوم کی بربادی کی فکر اور مستقبل کی تعمیر کا جنون۔ دراصل اس زمانہ سے بہت پہلے خلافت کی تحریک میں وہ باقاعدہ سیاسی میدان میں آچکے تھے اور اس وقت تو دنیا انہیں اس وقت کی مقبول عالم جمعیۃ العلماء ہند کے نوجوان گروپ کے ایک سربرآوردہ لیڈر کی حیثیت سے جانتی تھی۔ ڈابھیل کی زندگی عجیب تھی، کھانے پر سب احباب ساتھ بیٹھتے، ملکی معاملات پر بحث ہوتی، مفتی عتیق الرحمن اور مولانا حفظ الرحمن کی ایک رائے ہوتی اور مولانا بدرِ عالم کا کچھ اور خیال، بعض وقت بحث طویل ہوجاتی، کھنچ جاتی، مولانا مخصوص انداز میں برس پڑتے، بگڑ اٹھتے، بے تکان بولتے اور بحث و مذاکرہ کا یہ سلسلہ گھنٹوں جاری رہتا۔ استاذ محترم کے یہاں دن میں کئی کئی بار حاضری کا معمول تھا، جب آتے علمی مسائل پر استفسار کرتے اور جب جاتے تو بہت کچھ لے کر لے جاتے، ان کے استاذ کو خود ان کے ساتھ اتنی محبت تھی کہ باید وشاید، استاذ کا دربار وہ تھا کہ فراست وہوشمندی کو دامن سنبھال کر بیٹھنا پڑتا تھا، اور علم وفضل یہاں چوکنے ہو کر آتے اور شرمندہ ہو کر جاتے تھے، ایسے کے دل میں جگہ پیدا کرنا بہت مشکل تھا، مگر استاذ کے تعلق کا یہ عالم کہ شاید ۱۹۳۱ء کے آخر میں مولانا گرفتار ہو کر جب میرٹھ جیل گئے تو استاذ یہ خبر سن کر تڑپ اٹھے، ہائے وہ شفقت بھرے الفاظ کہ ''یہ صاحب عجب قسم کے آدمی ہیں، انہی باتوں میں اپنا وقت خراب کرتے ہیں، اب وہاں جا پڑے ہیں، خبر نہیں وہاں کیا گذرے اور کس طرح بسر ہوئے''، جب تک جیل میں رہے استاذ کے دل سے نہیں اترے، برابر پوچھتے رہے، خط لکھتے رہے، دعامیں یاد رکھتے۔

مولانا میرٹھ جیل سے چھوٹے تو دیوبند آئے، یہاں استاذ تھے، پہلے ان کی قدم بوسی کی پھر آگے گھر گئے، میرٹھ جیل سے رہا ہو کر ان کا دیوبند آنا نگاہوں میں پھرتا ہے، سردی کا زمانہ تھا، شام کا جھٹپٹا سا وقت، جب مولانا پوری متانت وسنجیدگی کے ساتھ تانگے سے اترے اور استاذ نے بڑھ کر ان کا خیر مقدم کیا۔ سیاسی رہ نما اور مقرر و مصنف کی حیثیت سے آج وہ ہزاروں پر بھاری ہیں، مگر درس وتدریس میں بھی ان کا اپنا خاص رنگ تھا، حدیث وتفسیر کی اعلیٰ کتابیں ان کے زیر درس تھیں، اور یہ خاص شغف ومحنت سے پڑھاتے تھے، ایک سال مشکوٰۃ شریف آپ کے یہاں تھی، عصر کے بعد پڑھاتے تھے، طلبا کی بڑی جماعت ہوتی تھی، اور سب اس خوش بیان مدرس کی تقریر پر فدا تھے، یہ کم عمر اور بدذوق بچہ بھی تقریر کے جوش وروانی سے محفوظ ہونے کے لیے گھنٹوں سبق میں بیٹھا رہتا تھا، ڈابھیل کی زندگی کے سینکڑوں واقعات ہیں، بدقسمتی سے اب وہ مجلس ہی درہم برہم ہوگئی، نہ وہ مکین رہے اور نہ وہ مکان، جن بزرگوں کے فیض سے علم وفضل کی یہ مجلسیں آباد تھیں اور صوبہ گجرات کے ایک دور ودراز گوشہ میں ایک قابل رشک علمی ماحول پیدا ہوگیا تھا وہ سب اللہ کو پیارے ہو گئے۔

ابا جی مرحوم نے برسہا برس گذرے اس عالم سے کوچ کیا، حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کئی سال تک دار العلوم کی صدارت اہتمام پر فائز رہے اور پھر علم وفضل کا یہ آفتاب بھی غروب ہوگیا، مولانا سراج احمد رشیدی بھی رخصت ہوئے، مولانا مفتی عتیق الرحمن نے ندوۃ المصنفین کا ڈھانچہ کھڑا کر لیا، مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی نے برہان کی ایڈیٹری شروع کر دی، مولانا بدرِ عالم صاحب کہیں سے کہیں پہنچ گئے، مولانا حفظ الرحمن کا تصور آتا ہے تو ڈابھیل کی اس زندگی کے سارے اوراق ذہن میں گھوم پڑتے ہیں، کھانے پینے کا کوی اہتمام حسب عادت یہاں بھی نہیں تھا، کھدّر کے دو چار جوڑے ان کے لیے بہت تھے، البتہ صاف ستھری شیروانی اور اچھا سا جوتا، یہ ان کی مرغوب چیزیں ہیں، کھانے پینے میں کوئی خاص ذوق نہیں رکھتے، کبھی اگر مانگتے ہیں تو کھانے کے بعد میٹھی کوئی چیز۔ اُڑد، ان کے ضلع بجنور کی خاص غذا ہے، یہی انہیں بھی مرغوب تھی، وہاں کھانے کا ہوش ہی کسے تھا، کھانا سامنے آیا اور کوئی بحث چھڑ گئی، اب نہ کھانے کا ہوش ہے نہ پینے کا، بحث ومباحثہ میں وقت کٹا، دسترخوان بڑھا دیا گیا اور دس پانچ نوالے بمشکل حلق سے اترے، اسی زندگی کا یہ ایک لطیفہ دوپہر کو مولانا اپنے کمرے میں آرام کرسی پر پڑے ہوئے کتاب دیکھ رہے تھے، بخار کا موسم تھا، سردی چڑھی اور بخار حملہ آور ہوا، میں بیٹھا ہوا تختی لکھ رہا تھا، مولانا نے کہا کہ ازہر اندر سے لحاف لا کر مجھے اڑھا دو، سردی لگ رہی ہے، لحاف اُڑھا دیا گیا، فرمایا کہ میری کمر

سے لگ کر لیٹ جاؤ تا کہ سردی کم ہو، کمر سے لپٹ کر لیٹ گیا،مگر نو دس سال کا بچہ،شوخی اور شرارت خاصۂ عمر دس پندرہ منٹ کے بعد طبیعت اس کام سے اکتا گئی اور بھاگنا چاہا،تو لحاف کے اندر ہی آہستہ سے پاؤں میں چونٹی بھر لی،مولانا نے مجبوراً بھگا دیا۔

ابا جی مرحوم کے ساتھ جب پہلی مرتبہ ڈابھیل گیا تو مولانا اس عمارت کے سامنے کھڑے تھے،جس میں وہ اور ہم سب رہتے تھے، کھدّر کا کرتہ، پاجامہ اور گاندھی کیپ میرے سر پر تھے اوچپل پاؤں میں، مولانا دیکھ کر مسکرائے کہ اخوہ پورے لیڈر بنے ہوئے ہو،ڈابھیل کے بعد کئی سال کلکتہ اور امروہہ میں بسر کیے،کلکتہ میں تبلیغی خدمت پیش نظر تھی،اور امروہہ میں درس وتدریس کا مشغلہ اور پھر ۳۸ء سے دہلی میں مستقل قیام ہے، یہاں وقت کا ایک حصہ ندوۃ المصنفین کی نذر ہوتا رہا، دوسرا حصہ علماء اور کانگریس کے، ندوۃ المصنفین کے وقت میں دس بارہ اعلیٰ درجہ کی کتابیں لکھ ڈالیں اور جمعیۃ وکانگریس کے کاموں میں ہزاروں میل کا سفر کیا، ہزاروں تقریریں ہوئیں، مسلمانوں سے برسہا برس تک گالیاں کھائیں، قاتلانہ حملوں کا مقابلہ کرنا پڑا، غداری کے طعنے سنے، ہندوؤں کے ہاتھ میں بک جانے کی تہمت دھری گئی، اخباروں نے ہزاروں صلواتیں سنائیں، مخالفین نے تکلیف دینے میں کسر نہ اٹھا رکھی، کچھ وقت ایسے بھی گذرے کہ عزت وآبرو تو الگ رہی جان کی سلامتی بھی مشکل تھی، کہ صرف دہلی نہیں بلکہ پورا ملک اور پوری قوم مخالف تھی، مگر اپنی زندگی کی وضع میں مطلق فرق نہیں آیا، جو رائے کل تھی وہی آج رہی، اور جس طرح کل اس کا اظہار ہوتا تھا اسی طرح آج بھی ہوا، سچائی ہمیشہ ان کی زندگی کا اصول ہے، طبیعت سچائی کی اس لائن سے ہٹنے پر قادر ہی نہیں رہی، وقت نے کتنے ہی دھکے دیے مگر ان کے قدم میں لغزش نہ آئی، قوم نے کتنا ہی بُرا بھلا کہا مگر یہ قوم کا ساتھ نہ چھوڑ سکے، قوم اور اس کے ہر ہر فرد سے محبت وخلوص کا یہ عالم کہ دہلی کے ایک لیگی کارکن نے ایک جلسہ میں برملا ان پر حملہ کیا، مگر اب یہ لیگی لیڈر مجبور وحاجت مند بن کر سامنے آیا تو ادھر سے محبت وشفقت نے اس کا استقبال کیا اور سخت لفظوں سے بھی اس کا دل توڑنا گوارہ نہ ہوا، جلسوں میں کتنی مرتبہ قدرشناس قوم نے انہیں گالیاں دیں، اسٹیشنوں پر کہاں کہاں ان پر حملے ہوئے، چلتے پھرتے کتنے برس تک انہیں دلخراش آوازے سننے پڑے۔

اخبارات نے ان پر کیا کیا گند اُچھالا اور اس معصوم فطرت انسان پر جسے یقینا گناہ کا سلیقہ نہیں آتا، جھوٹے الزامات لگائے، اس کی تفصیل تو ان لوگوں کو معلوم ہوگی جو سیاسی کام میں ان کے شریک رہے، میں ایک گوشہ نشیں انسان، ایسے حوادث سے براہِ راست نہ مجھے کوئی تعلق اور نہ سیاسی اور اخباری دنیا کے ان

واقعات پر میری نظر، البتہ اتنا جانتا ہوں کہ گذشتہ دس بارہ برس مولانا حفظ الرحمن نے دفتر جمعیۃ میں چٹائی پر بیٹھ کر گذار دیے، کھانا اس وقت مل گیا تو شام کو ناغہ، شام کو مل گیا تو صبح کو ناغہ، جو سامنے آ گیا اس پر قناعت اور جو مل گیا اس پر صبر و شکر، بیس بائیس سال غیروں کے مظالم اور اپنوں کے مصائب سہنے میں گذر گئے، مگر پیشانی پر بل نہیں آیا، راستے کی صعوبتوں اور سفر کی تکلیفوں سے گھبرا کر بڑوں بڑوں نے ساتھ چھوڑ دیا مگر حفظ الرحمن نے منزل مقصود پر ہی آ کر دم لیا، چاہتے تو امیرانہ زندگی گذار سکتے تھے، رزق کے لیے حیلہ اور کوشش کی ضرورت ہے، ان امور پر توجہ ہوتی تو کم از کم اپنے بیوی بچوں کے لیے تو اچھی زندگی پیدا کر دیتے، مگر یہاں امارت وغربت کا امتیاز ہی کوئی نہیں، بقدر لا یموت رزق حاصل کرنا اور وقت کا بڑا حصہ مسلمانوں کی خدمت میں بسر کرنا ہی مقصود زندگی ہے، بیوی اللہ کی کوئی نیک بندی پلّے بندھ گئی ہے، اسی طرح اولاد بھی شریف ہے، جس نے مولانا حفظ الرحمن کی ان تمام عادتوں میں ان کا ساتھ دیا، اور سارے مصائب میں ان کے شریک حال رہے، ورنہ یہی اولاد وکنبہ اور گرہستی اکثر انسان کو ہوس پرستی کا شکار کر دیتی ہے۔ تیسرے سال بڑی لڑکی کی تقریب میں سب دوست واحباب بلائے گئے، از ہر بھی سیوہارہ میں اس موقعہ پر حاضر تھا، غریب کے پاس سرمایہ کیا کہ تقریب تقریب کی طرح ہوتی، جس نے جوانی کے تمام اوقات جیلوں میں گذار دیے اور دل ودماغ کی ساری طاقتیں قوم کے سود و بہبود پر خرچ کر ڈالیں، اس کی جیب میں نقدی کا کیا سوال؟ مگر دعوت وضیافت کا جو انتظام تھا اس میں مولانا کی فراخ دلی جھلک رہی تھی دوسروں کی خاطر تواضع اپنی ہمت سے بڑھ کر کی اور ایسی کی کہ اس تقریب سے واپسی پر حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے ریل میں فرمایا کہ ’’مولوی صاحب نے خواہ مخواہ تکلیف کی اب قرض دار ہو گئے ہوں گے‘‘۔

بڑے بوڑھے لوگ کہتے ہیں اور اپنے تجربہ سے بھی معلوم ہوا کہ دنیا میں ایک آدمی گناہ کرتا ہے تو بعض وقت اس کی نحوست اور وبال کئی بے گناہوں کو بھی گرفت میں لے لیتے ہیں، اور کسی ایک کی نیکیاں بسا اوقات بہت سے گناہگاروں کے لیے جائے پناہ بن جاتی ہیں، رحمت حق نکوکار انسان کی ہمسائیگی اور قرب وتعلق کی بنا پر اوروں کی بھی رعایت کرتی ہے، خود اپنی نظروں سے دیکھا کہ بعض مکانات میں گناہوں کی بھٹی گرم ہوتی ہے، سیاہ کاریوں کے شعلے بھڑکتے ہیں، فسق وفجور کی لپٹیں اٹھتی ہیں، ظلم وتعدی کا تنور دہکتا ہے، ساری فضا گناہوں کے پسینہ سے شرابور ہوتی ہے، اور در وبام کی پیشانیاں گناہوں کی زیادتی اور کثرت سے بے رنگ وروغن نظر آتی ہیں مگر ایسے گندے ماحول پر بھی معبود کا غضب نازل نہیں

ہوتا اور قدرت اس کی دار و گیر میں ڈھیل دیتی ہے، کسی کو نظر آئے یا نہ آئے مگر بتحقیق دیکھئے تو قرب و جوار میں ضرور کوئی ایسا فرد موجود ملے گا، جس کی خواہشات نفسانی رضائے الٰہی کے سامنے سکڑ اور سمٹ کر رہ گئی ہوں گی اور جس کی نیکیوں پر فرشتے بھی رشک کرتے ہوں گے اور جس کے سجدۂ عبودیت کے لیے حورانِ بہشتی بھی شوق و بے تابی کے ساتھ اپنی چادریں بچھاتی ہوں گی، اس ماحول پر خدا کے رحم اور عفو و کرم کی سبب یہی نیک ذات ہوگی۔

میں سمجھتا ہوں کہ مولانا حفظ الرحمن کا وجود مسلمانانِ ہند کی موجودہ نسل کے لیے ایسی ہی رحمت و برکت الٰہیہ کا باعث ہے، یہ سادہ دل، صاف باطن، پاک ضمیر، بلند فطرت اور گرم مزاج کا انسان مسلمانوں کی موجودہ نسل کے لیے خود ایک مستقل بشارت اور مستقل نعمت ہے، اس کی فطرت گناہوں سے پاک ہے، اس کی طبیعت بے رِیا ہے، قلب صاف وشفاف ہے، جس میں دشمنوں اور دوستوں سب کے لیے محبت وخلوص ہے، اس کی تحریر میں سادگی ہے، سادگی میں بناؤ اور معانی ومضامین کی گہرائی ہے، اس کی تقریر ایک ایسا پُرجوش دریا ہے، جو جوش وخروش اور پوری طاقت کے ساتھ بہنے کے باوجود آبادیوں بستیوں اور کھیتیوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا، اس کی گفتگو میں گرمی ہے مگر ایسی گرمی جو عام قلوب انسانی کو بلند ارادوں اور بلند خیالات کی حرارت بخشتی ہے، وہ جب بولتا ہے تو مکر وفریب کاری کی دنیا پر بجلیاں گرادیتا ہے اور سچائی اور عام انسانی ہمدردی کے تمام مدھم حروف اس کی روشنی سے جگمگا اٹھتے ہیں، ان کی شخصیت من حیث المجموع ایک شمشیر آبدار ہے جو دشمنوں کو کاٹتی چھانٹتی چلی جاتی ہے اور یہ شمشیر مظلوم دوستوں کے لیے وقت ضرورت سپر کا کام دیتی ہے، ان کی زندگی میں نہ سخن پروری ہے نہ فلسفیانہ نکتہ طرازی اور نہ امیرانہ تنعم پرستی وہ خود عمل پسند ہیں اس لیے ان کے پاس دوسروں کے لیے عمل اور جدو جہد کے سوا کوئی پیغام نہیں، مولانا مرحوم آج ہم میں موجود نہیں، ان کی لوحِ مزار پر کسی نے لکھا ہے ؎

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
ہوگئے خاک انتہا یہ ہے

یہ شعر مولانا کی زندگی کی ایک سچی تصویر ہے، انہوں نے بھرپور ولولوں، اخلاص مندانہ جذبات، تغیر آفریں تمناؤں، خدمت ملک وملت کی ایک سچی لگن اور پورے ملک کی فلاح وترقی میں ہمہ وقت اپنے دل ودماغ کی توانائیوں اور شادابیوں کو صرف کردینے کے ارادے کے ساتھ زندگی شروع کی، پھر ایک وضع، ایک طریقہ، ایک لگن، ایک دھن اور ایک سچائی پر اپنا عرصۂ عمر صرف کردیا، آج نہ ان کی پُرجوش تقریر ہے،

نہ عالمانہ تحریر، نہ ان کے دماغ کی نکتہ سنجی اور نکتہ آفرینی ہے اور نہ ان کے ذہن کی تابناکی انفرادیت اور آگے بڑھنے اور سب سے آگے رہنے کی صلاحیت، نگاہیں اس حفظ الرحمن کو ڈھونڈھتی ہیں، جو غریبوں کی امداد کے لیے سینہ سپر رہتا تھا، مظلوم جس کے ساتھی اور زندگی کے دمساز تھے، جس کی شفقت چھوٹوں کے لیے وقف، اور جس کا ادب واحترام بڑوں اور بزرگوں کے لیے فرشِ راہ بنا تھا، جو بجلی کی طرح کڑکتا، آندھی کی طرح اٹھتا، بادل کی طرح گرجتا اور بارش کی طرح برستا تھا۔ ہزاروں اور لاکھوں کے مجمع میں سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک شیدا بیان خطیب۔ مجلسوں، میٹنگوں میں بڑی اور اہم تجاویز کا مجوز، بڑے بڑے اداروں اور قومی تحریکات کا قائد، دوستوں کا جاں نثار، بزرگوں کا نام لیوا، قدامت کی دلپذیر تقریروں کا محافظ، جدت کے مفید نقشوں اور خاکوں کا امین، کبھی ہنستا اور مسکراتا ہوا حفظ الرحمن کبھی لڑتا اور جھگڑتا ہوا حفظ الرحمن، کہیں رضا کار، کہیں قائد، کہیں مصنف، کہیں مورخ، کہیں مدرس اور کہیں فوج کا ایک سپاہی۔

صبح شام سے اور شام صبح سے بدلتی رہے گی، اندھیرے کی جگہ تاریکی اور تاریکی کی جگہ اندھیرا ہوگا، وقت تیز رفتاری کے ساتھ اپنی منزلیں طے کرتا رہے گا، اور عمر انسان منٹوں اور سکنڈوں سے گذر کر اپنے انجام تک پہنچتی رہے گی، مگر ممکن نہیں کہ حفظ الرحمن کی صورت کہیں نظر پڑے ؎

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہوگئیں

حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ ایک دیہاتی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا ''یارسول اللہ! مجھے کوئی ایسا عمل بتا دیجئے کہ جس کے کرنے سے میں جنت میں داخل ہوں جاؤں، آپ ﷺ نے فرمایا ''اللہ کی عبادت کرو۔ کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ، فرض نماز پڑھو، فرض زکوٰۃ ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو'' یہ سن کر دیہاتی نے کہا ''اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں نہ تو اس پر کچھ زیادہ کروں گا اور نہ اس میں سے کچھ کم کروں گا، جب وہ دیہاتی چلا گیا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو شخص کسی جنتی آدمی کو دیکھنے کی سعادت اور مسرت حاصل کرنا چاہے وہ اس شخص کو دیکھ لے۔'' (بخاری)

حجیت حدیث
اور
تدوین حدیث

مولانا محمد اسلام صاحب قاسمی
استاذ حدیث وادب عربی دارالعلوم وقف دیوبند

امت محمدیہ کا اس بات پر اجماع ہے کہ حدیث دین کا بنیادی ماخذ ہے، اور قرآن کے بعد شریعت کا دوسرا استون، محققین اہل علم کا قول ہے کہ حدیث صحیح تمام امت پر حجت ہے، اور ان کی تائید میں قرآنی آیات بھی ہیں، جن میں اطاعت رسول کو فرض قرار دیا گیا ہے۔ اور اس واضح حکم کے بعد علمی بحث وتمحیص کی ضرورت باقی نہیں رہتی، اس لیے کہ جن آیات سے اطاعت رسول کی فرضیت معلوم ہوتی ہیں، صریح اور نا قابل تاویل ہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی صورت صرف یہی ہے کہ حدیث کی پیروی کی جائے اور قرآن کریم کے بعد حدیث کو قانون اسلامی کا دوسرا ماخذ قرار دیا جائے۔

مگر بیسویں صدی کے آغاز میں جب مسلمانوں پر مغربی اقوام کا سیاسی نظریاتی تسلط بڑھا تو کم علم مسلمانوں کا ایسا طبقہ وجود میں آیا جو مغربی افکار سے بے حد مرعوب تھا، وہ یہ سمجھتا تھا کہ دنیا میں ترقی بغیر تقلید مغرب کے حاصل نہیں ہوسکتی۔ لیکن اسلام کے بہت سے احکام اس کے راستے میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے، اس لیے اس نے اسلام میں تحریف کا سلسلہ شروع کیا، تاکہ اسے مغربی افکار کے مطابق بنایا جاسکے، اس طبقہ کو اہل تجدد کہا جاتا ہے۔ یہ طبقہ مصر میں ہندوستان میں اور ترکی میں نمایاں ہوا۔ اس طبقہ کے مقاصد اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتے تھے، جب تک حدیث کو راستہ سے نہ ہٹایا جائے۔ کیوں کہ احادیث میں زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق ایسی مفصل ہدایات موجود ہیں، جو مغربی افکار سے متصادم بھی ہیں۔ چنانچہ اس طبقہ کے بعض افراد نے دبے لفظوں میں حدیث کو حجت ماننے سے انکار کیا، جس کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ جہاں کوئی حدیث اپنے مدعا کے خلاف نظر آئی، اس کی صحت سے انکار کردیا، خواہ اس کی سند کتنی ہی قوی کیوں نہ ہو۔ اور ساتھ ہی کہیں کہیں اس بات کا بھی اظہار کیا جاتا رہا، کہ یہ احادیث موجودہ دور میں حجت

نہیں ہونی چاہئیں، اوراس کے ساتھ بعض مقامات پر مفید مطلب احادیث سے استدلال بھی کیا جاتا رہا۔ اسی ذریعہ سے تجارتی سود کو حلال کیا گیا، معجزات کا انکار کیا گیا، پردہ کا انکار کیا گیا، اور بہت سے مغربی نظریات کو سند جواز دی گئی۔

اس کے بعد نظریہ انکار حدیث میں ترقی ہوتی گئی، اور یہ نظریہ کسی قدر منظم طور سے عبداللہ چکڑالوی کی قیادت میں متحدہ ہندوستان میں آگے بڑھا۔ یہ منکرین حدیث پر مشتمل ایک فرقہ تھا، جو اپنے آپ کو اہل قرآن کہتا تھا، جس کا مقصد حدیث سے کلیتاً انکار کرنا تھا، اس کے بعد اسلم جیراجپوری نے اس نظریہ کو اور آگے بڑھایا، یہاں تک کہ پاکستان میں غلام احمد پرویز نے اس فتنے کو مزید منظم کیا۔

انکار حدیث کا فتنہ

منکرین حدیث کے مختلف طبقوں سے ان کے جو نظریات ظاہر ہوئے ان کا اگر خلاصہ کیا جائے تو دو طرح کے لوگ سامنے آئے۔

(۱) ایک طبقہ وہ تھا جنھوں نے کہا کہ احادیث نبویہ صحابہ کے بعد امت کے لیے حجت نہیں، اسلامی شرائع اور نظام کے لیے قرآن کی ہدایت کافی ہے اور حدیث کی قطعی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس کو ایک تاریخی ورثہ مان سکتے ہیں۔

(۲) دوسرا طبقہ وہ تھا جس نے کہا کہ ہم حدیث کو حجت مانتے ہیں، مگر وہ ہم تک صحیح طور پر نہیں پہنچ سکیں، کیوں کہ حدیث کی تدوین ہی تیسری صدی ہجری میں ہوئی اور اس دوران حافظہ کی بنیاد پر روایت کو مکمل محفوظ نہیں کہا جاسکتا۔ اس لیے حدیث حجت نہیں ہوسکتی۔

لیکن پہلے طبقہ کے جواب کے طور پر قرآن کی یہ آیت کافی ہوگی جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے "**ویعلمهم الکتاب والحکمة**" نیز ارشاد ہے "**وانزلنا الیك الذکر لتبین للناس مانزل الیهم**" ان آیتوں سے واضح ہے کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف کتاب پہنچانے کی حد تک پیغمبر نہیں بنایا گیا، بلکہ تعلیم کتاب وحکمت اور تبیین وتشریح بھی آپ کا منصب تھا۔ اب اگر آپ کے ارشادات حجت نہیں تو کتاب وحکمت کی وضاحت کس طرح ہوسکتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ تشریح کے بغیر تعلیم ممکن نہیں۔ تو جب تک آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں حجت نہ ہوں تو تعلیم کا کیا فائدہ۔

قرآن میں جگہ جگہ "اطیعو اللہ" کے ساتھ "اطیعو الرسول" کے الفاظ مذکور ہیں، جو صراحتاً حجیت حدیث پر دلالت کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بنیادی سوال یہ ہے کہ جب اللہ کے رسول نے فرمایا "یا ایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعاً"، تو اس میں کسی جماعت یا کسی زمان ومکان کی تخصیص کہاں رہی۔ اور پھر اگر فہم قرآن کے لیے تعلیم رسول کی ضرورت نہیں ہے تو پھر آپ کو رسول بنا کر کیوں بھیجا گیا۔

اور دوسرا طبقہ جو یہ کہتا ہے کہ احادیث حجت تو ہیں لیکن ہم تک قابل اعتماد ذرائع سے نہیں پہنچیں اس پر مندرجہ ذیل دلائل ہیں:

(۱) ہم تک قرآن بھی انھیں واسطوں سے پہنچا ہے، جن واسطوں سے حدیث آئی ہے، اب اگر یہ واسطے نا قابل اعتماد ہیں تو لامحالہ طور پر قرآن سے بھی ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ منکرین حدیث اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ قرآن نے انا لہ لحافظون کہہ کر اپنی حفاظت کا ذمہ خود لیا ہے، حدیث کے بارے میں ایسی کوئی ذمہ داری نہیں لی گئی، لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ انا لہ لحافظون کی آیت بھی تو ہم تک انھیں واسطوں سے پہنچی ہے جن واسطوں سے حدیث پہنچی ہے، تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ کسی نے اپنی طرف سے یہ آیت نہیں بڑھائی۔

(۲) یہ یاد رہے کہ قرآن اہل علم کے نزدیک نام ہے نظم اور معانی دونوں کا، یعنی لفظ اور مفہوم دونوں کا، اسی لیے یہ آیت صرف الفاظ قرآن کے لیے نہیں بلکہ معانی قرآن کے لیے بھی حفاظت کی ضمانت لیتی ہے، اور معانی قرآن کی تعلیم حدیث سے ہوئی، اس طرح حدیث کی ذمہ داری بھی گویا اللہ نے خود لی۔

(۳) اور جب یہ کہا جائے کہ احادیث واجب العمل ہیں تو لامحالہ طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ قیامت تک محفوظ رہیں گی۔ ورنہ یہ لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ نے احادیث کو واجب العمل تو کر دیا لیکن اس کی حفاظت کا کوئی انتظام نہیں فرمایا اور یہ بات لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا کے بالکل خلاف ہے۔

تدوین حدیث کی مختلف صورتیں

منکرین حدیث یہ کہا کرتے ہیں کہ احادیث تیسری صدی ہجری میں مدوّن کی گئیں، اس لئے یہ اعتماد نہیں ہے کہ وہ اصلی صورت پر باقی رہی ہوں، لیکن یہ مغالطہ بالکل بے بنیاد ہے، اس لئے کہ سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ حدیث کی حفاظت کا عہدِ رسالت سے لے کر اب تک کیا اہتمام ہوا، حفاظت حدیث

کا راستہ صرف کتابت ہی نہیں، بلکہ دوسرے قابل اعتماد ذرائع بھی ہیں، اور تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد رسالت اور عہد صحابہؓ میں حفاظت حدیث کے لئے تین طریقے استعمال کئے گئے، جو مندرجہ ذیل ہیں۔

پہلا طریقہ: حفظ روایت

حفاظت حدیث کا پہلا طریقہ احادیث کو یاد کرنا ہے اور یہ طریقہ اس دور کے لحاظ سے انتہائی قابل اعتماد تھا، اہل عرب کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی حافظے عطا فرمائے تھے، وہ صرف اپنے ہی نہیں بلکہ اپنے گھوڑوں تک کے نسب نامے ازبر یاد کرلیا کرتے تھے، ایک ایک شخص کو ہزاروں اشعار حفظ ہوتے تھے اور بسااوقات کسی بات کو صرف ایک بار سن کر یا دیکھ کر پوری طرح یاد کر لیتے تھے، تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں جن میں سے ایک دو یہاں بیان کی جاتی ہیں۔

صحیح بخاری میں حضرت جعفر بن عمرو الضمری بیان کرتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ عبید اللہ بن عدی بن الخیار کے ساتھ حضرت وحشیؓ سے ملنے گیا، عبید اللہؓ نے اُن سے پوچھا کہ کیا آپ مجھے پہچانتے ہیں؟ تو حضرت وحشیؓ نے فرمایا کہ میں آپ کو پہچانتا تو نہیں البتہ مجھے اتنا یاد ہے کہ آج سے سالہا سال پہلے میں ایک دن عدی بن الخیار نامی ایک شخص کے یہاں گیا تھا، اس دن عدی کے یہاں ایک بچہ پیدا ہوا تھا، میں اس بچہ کو چادر میں لپیٹ کر اس کی مُرضعہ کے پاس لے گیا تھا، بچہ کا سارا جسم ڈھکا ہوا تھا، صرف پاؤں میں نے دیکھے تھے، تمہارے پاؤں اس بچہ کے پاؤں کے ساتھ بہت مشابہ ہیں۔

غور کرنے کی بات ہے کہ جو قوم اتنی معمولی باتوں کو اتنے وثوق کے ساتھ یاد رکھتی ہو وہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کو یاد رکھنے کا کتنا اہتمام کرے گی، جبکہ وہ انھیں اپنے لئے راہِ نجات سمجھتے ہوں، خاص طور سے جب کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ان کے سامنے آچکا تھا کہ:

نضر اللہ عبدا سمع مقالتی فحفظها ووعاها واداها الخ رواه الشافعی والبیهقی فی المدخل ورواه احمد والترمذی وابوداؤد و ابن ماجة والدارمی عن زید بن ثابت۔ (مشکوٰۃ المصابیح کتاب العلم، الفصل الثانی، ج:۱ص۳۵)

حافظ ابن حجرؒ نے اپنی کتاب "الاصابہ" میں نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ عبدالملک بن مروان نے حضرت ابو ہریرہؓ کے حافظہ کا امتحان لینا چاہا اور انھیں بلا کر احادیث بیان کرنے کی درخواست کی، حضرت ابو ہریرہؓ نے بہت سی احادیث سنائیں، ایک کاتب ان کو لکھتا رہا، یہاں تک کہ حضرت ابو ہریرہؓ چلے

گئے، عبدالملک نے اگلے سال انھیں پھر بلوایا، اور ان سے کہا کہ جو احادیث آپ نے پچھلے سال لکھوائی تھیں، وہی احادیث اسی ترتیب کے ساتھ سنایئے، حضرت ابو ہریرہؓ نے پھر احادیث سنانی شروع کیں، کاتب اپنی کتاب سے ان کا مقابلہ کرتا رہا، کسی جگہ ایک حرف ایک نقطہ ایک شوشہ کی تبدیلی نہیں کی، انتہاء یہ ہے کہ ترتیب بھی بالکل وہی تھی اور کوئی حدیث مقدم ومؤخر نہیں ہوئی۔

اس قسم کے حیرت انگیز واقعات اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کو غیر معمولی حافظے صرف حفاظت حدیث کے لیے عطا فرمائے تھے، بلا شبہ ایسے حافظے حدیث کے لیے اتنے ہی قابل اعتماد ذرائع ہیں جیسے کتابت۔

دوسرا طریقہ: تعامل

حفاظت حدیث کا دوسرا طریقہ جو صحابہؓ نے اختیار کیا تھا، وہ تعامل تھا، یعنی وہ آپؐ کے اقوال و افعال پر بجنسہا عمل کر کے اُسے یاد کرتے تھے، بہت سے صحابہ سے منقول ہے کہ انھوں نے کوئی عمل کیا اور اس کے بعد فرمایا ہٰکذا رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یفعل، یہ طریقہ نہایت قابل اعتماد طریقہ ہے، اس لئے کہ جس بات پر انسان خود عمل کرے وہ ذہن میں "**کالنقش علی الحجر**" ہوتی ہے۔

کتابت حدیث

احادیث کی حفاظت کتابت کے ذریعہ سے بھی کی گئی، اور تاریخی طور پر کتابت حدیث کو چار مراحل پر تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) متفرق طور سے احادیث کو قلمبند کرنا۔

(۲) کسی ایک شخصی صحیفہ میں احادیث کو جمع کرنا، جس کی حیثیت ذاتی یادداشت کی ہو۔

(۳) احادیث کو کتابی صورت میں بغیر تبویب کے جمع کرنا۔

(۴) احادیث کو کتابی صورت میں تبویب کے ساتھ جمع کرنا۔

عہد رسالت اور عہد صحابہ میں کتابت کی پہلی دو قسمیں اچھی طرح رائج ہوچکی تھیں، منکرین حدیث عہد رسالت میں کتابت حدیث کو تسلیم نہیں کرتے اور مسلم وغیرہ کی اُس حدیث سے استدلال کرتے ہیں جو ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا "**لاتکتبوا عنی ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحه**"، منکرین حدیث کا کہنا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کتابت حدیث سے منع فرمایا، اس کی

دلیل ہے کہ اُس دور میں حدیثیں نہیں لکھی گئیں، نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ احادیث حجت نہیں، ورنہ آپ انھیں اہتمام کے ساتھ قلمبند فرماتے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ کتابت حدیث کی یہ ممانعت ابتداء اسلام میں تھی، اوراس کی وجہ یہ تھی کہ اُس وقت تک قرآن کریم کسی ایک نسخہ میں مدوّن نہ ہوا تھا، بلکہ متفرق طور سے صحابہ کے پاس لکھا ہوا تھا، دوسری طرف صحابہ کرام بھی ابھی تک اسلوبِ قرآن سے اتنے مانوس نہ تھے، کہ وہ قرآن اور غیر قرآن میں باوّلِ نظر تمیز کرسکیں، ان حالات میں اگر احادیث بھی لکھی جاتیں، تو خطرہ تھا کہ وہ قرآن کے ساتھ گڈ مڈ ہوجائیں، اس خطرہ کے پیش نظر اوراس کے انسداد کے لئے آپ نے کتابت حدیث کی ممانعت فرمادی، لیکن جب صحابۂ کرام اسلوب قرآن سے پوری طرح مانوس ہوگئے تو آپ نے کتابت حدیث کی اجازت بھی دے دی، جس کے متعدد واقعات کتب حدیث میں منقول ہیں۔

(۱) جامع ترمذی میں امام ترمذیؒ نے ابواب العلم میں اس پر ایک مستقل باب قائم کیا ہے، "باب ماجاء فی الرخصة فیه"، اوراس میں حضرت ابوہریرہؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ "قال کان رجل من الانصار یجلس الی رسول الله صلی الله علیه وسلم فیسمع من النبی ﷺ الحدیث فیعجبه ولا یحفظه فشکی ذلك الی رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال یارسول الله الی لَاَسْمَعُ من الحدیث فیعجبنی ولا احفظه فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم استعن بیمینك واومأ بیده الخط"۔ (جامع ترمذی ج:۲، ص:۱۰۶-۱۰۷)

(۲) امام ابوداؤدؒ اپنی سنن میں اور امام حاکمؒ مستدرک (ج:۱، ص ۱۰۴، کتاب العلم، الامر بکتابۃ الحدیث) میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت کرتے ہیں کہ "کنت اکتب کل شیئ اسمعه من رسول الله صلی الله علیه وسلم ارید حفظه فنهتنی قریش وقالوا اتکتب کل شیئ تسمعه ورسول الله صلی الله علیه وسلم بشر یتکلم فی الغضب والرضا فامسکت عن الکتابة فذکرت ذلك الی رسول الله صلی الله علیه وسلم فأومأ باصبعه الی فیه فقال اکتب فوالذی نفسی بیده ما یخرج منه الا حق"۔ (لفظه لابی داؤد، ج۲ص۵۱۳-۵۱۴، کتاب العلم)

(۳) مستدرک حاکم میں انہی حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا "قیدوا العلم قلت وما تقییده قال کتابته"۔ (مستدرك ج:۱، ص:۱۰۶، کتاب العلم قیدوا العلم بالکتابة)

(۴)عن ابی ھریرۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم خطب فذکر قصۃ فی الحدیث فقال ابو شاہ اکتبوا الی یا رسول اللہ فقال رسول اللہ اکتبوا لابی شاہ وفی الحدیث قصۃ، ھذا الحدیث حسن صحیح(ترمذی، ج:۲،ص:۱۰۷)(ابواب العلم ،باب ما جاء فی الرخصۃ فیہ)ورواہ البخاری فی کتاب العلم تحت باب کتابۃ العلم ج:۱،ص:۲۱و۲۳)

اس قسم کی احادیث اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ کتابت حدیث کی ممانعت کسی امر عارض کی بناء پر تھی اور جب وہ عارض مرتفع ہوگیا تو اس کی اجازت بلکہ حکم دیا گیا۔

علامہ نوویؒ نے منع کتابت حدیث کی ایک اور توجیہ ذکر کی ہے،اور وہ یہ کہ مطلقاً کتابت کسی بھی زمانہ میں ممنوع نہیں ہوئی، بلکہ بعض حضرات صحابہ ایسا کرتے تھے کہ آیات قرآنی لکھنے کے ساتھ ساتھ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح وتفسیر بھی اسی جگہ لکھ لیا کرتے تھے، یہ صورت بڑی خطرناک تھی، کیوں کہ اس سے آیاتِ قرآنی کے ملتبس ہوجانے کا قوی اندیشہ تھا، اس لیے صرف اس صورت ممانعت کی گئی تھی ،قرآن سے الگ احادیث لکھنے کی کوئی ممانعت نہیں تھی، علامہ نوویؒ کی یہ توجیہ بہت قرین قیاس ہے، اور اس کی تائید سنن نسائی کی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے، جو امام نسائیؒ نے "کتاب الصلوٰۃ باب المحافظۃ علی صلوٰۃ العصر" میں نقل کی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے اپنے ایک غلام کو قرآن کریم لکھنے کا حکم دیا، اور جب وہ اس آیت پر پہنچا کہ "حافظوا علی الصلوات والصلوٰۃ الوسطیٰ تو حضرت عائشہؓ نے لفظ وُسطیٰ کے بعد "وصلوٰۃ العصر "بڑھانے کا حکم دیا، ظاہر ہے کہ لفظ "العصر "قرآن کریم کا جز نہیں تھا، بلکہ بطور تشریح بڑھایا گیا تھا، اور اس زمانہ میں چوں کہ متن اور شرح میں امتیاز کی وہ علامات رائج نہیں تھیں، جو بعد رائج ہوئیں، اس لئے یہ لفظ متن ہی کے ساتھ لکھ دیا گیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے صحابہ بھی آپ کی بیان فرمودہ تشریحات اسی طرح لکھ لیتے ہوں گے، ظاہر ہے کہ اگر اس رواج کو عام ہونے دیا جاتا تو متن قرآن کی تعیین اور حفاظت ایک درد ِسر بن جاتی ، درحقیقت ممانعت کتابت حدیث کے ذریعہ اس عظیم خطرہ کا سد باب کیا گیا تھا، لیکن قرآن کریم سے الگ احادیث لکھنے کا رواج ہر دور میں جاری رہا، چنانچہ عہد صحابہ میں حدیث کے کئی مجموعے جو ذاتی نوعیت کے تھے تیار ہو چکے تھے، اس کی چند مثالیں مندرجہ ذیل ہیں:-

(۱)الصحیفۃ الصادقۃ:مسند احمد میں روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ نے

احادیث کا جو مجموعہ تیار کیا تھا اس کا نام "الصحیفۃ الصادقۃ" رکھا تھا، یہ عہد صحابہ کے حدیثی مجموعوں میں سب سے زیادہ ضخیم صحیفہ تھا، اُس کی احادیث کی کل تعداد یقینی طور سے معلوم نہیں ہوسکی، لیکن حضرت ابوہریرہؓ کی ایک روایت سے جو صحیح بخاری (ج: ۲،ص: ۲۲، کتاب العلم، باب کتابۃ العلم) وغیرہ میں موجود ہے، اس پر کچھ روشنی پڑتی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ "ما من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم احد اکثر حدیثا عنہ (ای عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم) منی الا ما کان من عبد اللہ بن عمرو فانہ کان یکتب ولا اکتب"

(۲) صحیفہ علیؓ: ابوداؤد (ج:۱،ص: ۲۷۸) "کتاب المناسک باب فی تحریم المدینۃ" کے تحت حضرت علیؓ کا یہ قول منقول ہے: "ما کتبنا عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الا القرآن وما فی ھذہ الصحیفۃ الخ" یہی رویت بخاری میں چار مقامات پر اور مسلم میں دو مقام پر اور نسائی وترمذی میں بھی تخریج کی گئی ہے، حضرت علیؓ کا صحیفہ ان کی تلوار کی نیام میں رہتا تھا، اور اس روایت کے متعدد الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں دیات اور معاقل، فدیہ اور قصاص، احکام اہل ذمہ، نصاب زکوٰۃ، اور مدینہ طیبہ کے حرم ہونے سے متعلق ارشادات نبوی درج تھے۔

(۳) کتاب الصدقۃ: یہ اُن احادیث کا مجموعہ تھا جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود املاء کرائیں تھیں، اس میں زکوٰۃ وصدقات اور عشر وغیرہ کے احکام تھے، اور سنن ابی داؤد سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب آپؐ نے اپنے عمال کو بھیجنے کے لیے لکھوائی تھی، لیکن ابھی آپ بھجوا نہ سکے تھے، کہ آپ کی وفات ہوگئی، آپ کے بعد یہ کتاب حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس رہی، پھر حضرت عمرؓ کے پاس آئی، پھر اُن کے دوصاحبزادوں حضرت عبداللہ اور عبیداللہ کے پاس آئی، پھر ان سے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے حاصل کر کے اس کی نقل کی اور ان سے حضرت سالم بن عبداللہ کے پاس منتقل ہوئی، حضرت سالم سے امام ابن شہاب زہریؒ نے اُسے حفظ کیا اور دوسروں کو پڑھایا۔

(۴) صحف انس بن مالکؓ: حضرت سعید بن ہلالؒ فرماتے ہیں کہ "کنا اذا اکثرنا علی انس بن مالک فاخرج الینا محالا عندہ فقال ھذہ سمعتھا من النبی صلی اللہ علیہ وسلم فکتبتھا وعرضتھا (تدوین حدیث للسید مناظر احسن گیلانی ص ۶۷ و ۶۸، بحوالہ مستدرک حاکم)

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت انسؓ کے پاس حدیث کے کئی مجموعے تھے۔

(۵) صحیفہ عمرو بن حزم: جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن حزمؓ کو نجران کا عامل بنا کر بھیجا تو ایک صحیفہ اُن کے حوالہ کیا، جو آپؐ کی احادیث پر مشتمل تھا، اور اسے حضرت اُبی بن کعبؓ نے لکھا تھا، ابوداؤد وغیرہ میں اس صحیفہ کے جو اقتباسات آئے ہیں، اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں طہارت، صلوٰۃ، زکوٰۃ، حج وعمرہ، جہاد، سیر ومغانم وغیرہ سے متعلق احادیث درج تھیں۔

(۶) صحیفہ ابن عباسؓ: طبقات ابن سعد میں حضرت کریب بن ابی مسلم کا جو ابن عباسؓ کے مولیٰ تھے، یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ انھیں حضرت ابن عباسؓ کی کتابوں کا اتنا ذخیرہ ملا تھا جو پورے ایک اونٹ کا بوجھ تھا۔

(۷) صحیفہ ابن مسعودؓ: علامہ ابن عبدالبرؒ نے اپنی کتاب "جامع بیان العلم وفضلہ" میں نقل کیا ہے کہ حضرت عبدالرحمن بن مسعودؓ نے ایک کتاب نکالی اور فرمایا کہ میں قسم کھاتا ہو کہ یہ عبداللہ بن مسعودؓ کی لکھی ہوئی ہے۔

(۸) صحیفہ جابر بن عبداللہ: صحیح مسلم میں روایت ہے کہ حضرت جابرؓ نے حج کے احکام پر ایک رسالہ تالیف کیا تھا، امام بخاریؒ نے تاریخ کبیر میں حضرت معمرؓ سے نقل کیا ہے، قال رأيت قتادة قال لسعيد بن ابي عروبة امسك على المصحف فقرأ البقرة فلم يخط حرفا فقال يا ابا النضر لانا لصحيفة جابر احفظ مني لسورة البقرة (كتاب التاريخ الكبير)

(۹) صحیفہ سمرہ بن جندب: حافظ ابن حجر نے تهذيب التهذيب میں نقل کیا ہے کہ سلیمان ابن سمرہ نے اپنے والد سمرہ بن جندب سے ایک بڑا نسخہ روایت کیا ہے۔

(۱۰) صحیفہ سعد بن عبادہ: امام ابن سعد نے طبقات میں نقل کیا ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ نے ایک صحیفہ مرتب کیا تھا، جس میں احادیث جمع کی تھیں۔

(۱۱) صحف ابی ہریرہؓ: امام حاکم نے مستدرک میں اور علامہ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں حضرت حسن بن عمرو کا یہ واقعہ نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوہریرہ کے سامنے ایک حدیث بیان کی، حضرت ابوہریرہ نے اس سے ناواقفیت کا اظہار فرمایا، میں نے عرض کیا کہ میں نے یہ حدیث آپ ہی سے سنی ہے۔ اس پر حضرت ابوہریرہ نے فرمایا کہ اگر یہ حدیث میں نے بیان کی ہوگی تو میرے پاس لکھی ہوئی ہوگی۔ چنانچہ وہ کچھ کتابیں نکال کر لائے، جن میں احادیث درج تھیں، ان میں تلاش کیا تو وہ حدیث مل گئی۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابو ہریرہؓ کے پاس بھی ان کی تمام مرویات صحیفوں کی صورت میں لکھی ہوئی موجود تھیں، واضح ہو کہ حضرت ابو ہریرہ عہد رسالت اور خلفاء کے ابتدائی دور میں احادیث نہیں لکھتے تھے، لیکن آخری عمر میں اس خیال سے کہ حدیث بھول نہ جائیں اپنی مرویات کو جمع کر لیا۔

چنانچہ ان کی طرف کئی صحیفے منسوب ہیں۔

۱۔مسند ابو هريره

۲۔مؤلف بشیر بن نهیك

۳۔صحیفه عبد الملك بن مروان

۴۔صحیفه همام بن منبه

یہ چند مثالیں اس بات کو واضح کرنے کے لیے کافی ہیں کہ عہد رسالت اور عہد صحابہ میں کتابت حدیث کا طریقہ خوب اچھی طرح رائج ہو چکا تھا۔ یہاں ہم نے صرف بڑے مجموعوں کا ذکر کیا ہے۔ ان کے علاوہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو انفرادی خطوط تحریر فرمائے یا کسی کو کوئی بات لکھ کر دی، یا فرامین جاری کئے، یہ اس کے علاوہ ہیں۔ گرچہ یہ ساری کوششیں انفرادی نوعیت کی تھیں، اور سرکاری سطح پر خلفاء ثلاثہ کے دور میں تدوین واشاعت کا ایسا اہتمام نہیں ہوا، جیسے جمع قرآن کا ہوا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا زمانہ

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانہ تک کتابت حدیث اپنے پہلے دو مرحلوں میں تھی، لیکن اب وہ وقت آچکا تھا، کہ احادیث کی باقاعدہ تدوین ہو، کیوں کہ اب قرآن کریم کے ساتھ اس کے اختلاط والتباس کا اندیشہ نہیں تھا، چنانچہ صحیح بخاری (ج:۱،ص:۲۰) پر باب کیف یقبض العلم کے تحت تعلیقاً مروی ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے مدینہ طیبہ کے قاضی ابوبکر بن حزم کے نام ایک خط لکھا، جس میں اُن کو حکم دیا کہ "انظر ما كان من حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم فاكتبه فاني خفت دروس العلم وذهاب العلماء"، مؤطا امام مالک میں بھی یہ خط مروی ہے اور اس میں احادیث نبوی کے ساتھ سنت خلفاء راشدین کے جمع کرنے کا حکم بھی مذکور ہے، مگر حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں روایت نقل کی ہے کہ یہ خط مملکت کے ہر صوبے کے قاضی کے نام بھیجا گیا تھا، اس کے الفاظ یہ ہیں فكتب بها الى الآفاق جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر نے اپنی سلطنت میں بڑے پیمانے پر تدوین حدیث کا کام شروع کیا تھا، چنانچہ پہلی صدی ہجری کے آخر میں مندرجہ ذیل کتب حدیث وجود میں آچکی تھیں:

(۱) کتب ابی بکر: قاضی ابوبکر کو جو حکم دیا تھا انھوں نے حدیث کی کئی کتابیں جمع فرمائی تھیں، لیکن حضرت عمر کو بھیجی نہیں تھیں کہ ان کی وفات ہوگئی۔

(۲) رسالہ سالم بن عبداللہ فی الصدقات: علامہ جلال الدین سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں نقل کیا ہے کہ یہ رسالہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی فرمائش پر لکھا گیا تھا۔

(۳) دفاتر الزہری: علامہ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں امام زہری کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ہم نے خلیفہ کے حکم سے حدیث وسنن کے دفتر کے دفتر لکھ ڈالے، پھر حضرت عمر نے مملکت کے ہر خطے میں ان دفاتر میں سے ایک دفتر بھیج دیا تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اس زمانے میں حضرت امام ابن شہاب زہری سے زیادہ تدوین حدیث کی خدمت شاید ہی کسی نے انجام دی ہو۔

(۴) کتاب السنن لمکحول: یہ کتاب امام ابن مکحول نے تحریر فرمائی تھی، جو حضرت عمر بن عبدالعزیز کے فرمان کی تعمیل تھی، وہ ان کے زمانے میں قاضی تھے۔

(۵) ابواب الشعبی: یہ حضرت عامر بن شرحبیل کی تالیف ہے، اور یہ علم حدیث کی پہلی مبوب کتاب ہے۔ حضرت شعبی کوفہ میں عمر بن عبدالعزیز کے قاضی تھے۔

چوں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی وفات سن ۱۰۱ھ میں ہوئی اس لیے یہ سب کتابیں اس سے پہلے ہی لکھی جا چکی تھیں۔

دوسری صدی ہجری میں تدوین حدیث

دوسری صدی ہجری میں تدوین حدیث کا کام اور زیادہ قوت کے ساتھ شروع ہوا، اس دور میں جو کتابیں حدیث کے موضوع پر لکھی گئی، ان کی تعداد بیس سے بھی زیادہ ہے۔ جن میں کچھ مشہور کتابیں یہ ہیں:

(۱) **کتاب الآثار لابی حنیفہ** علیہ الرحمۃ: اس کتاب میں پہلی بار احادیث کو فقہی ترتیب پر مرتب کیا گیا، علم حدیث میں اس کا پایہ بہت بلند ہے، اور امام ابوحنیفہؒ نے چالیس ہزار احادیث میں سے اس کتاب کا انتخاب فرمایا ہے، ذکرہ الموفق فی مناقب الامام ابی حنیفۃ، اس کتاب کے کئی نسخے ہیں، بروایت امام محمدؒ، بروایت امام ابو یوسفؒ، بروایت امام زفرؒ، اور یہ کتاب مؤطا امام مالک سے زماناً مقدم ہے، ادھر یہ بھی ثابت ہے کہ امام مالک نے امام ابوحنیفہ کی تالیفات سے استفادہ کیا، اس لیے یہ کتاب اپنی

طرز تدوین میں مؤطا امام مالک کی اصل کی حیثیت رکھتی ہے، بہت سے علماء نے اس کی شروح لکھیں، اور اس کے رجال پر کتابیں تصنیف کیں، جن میں حافظ ابن حجر بھی شامل ہیں۔

یہاں ایک بات یہ بھی یاد رکھنی چاہئے کہ علم حدیث میں امام ابوحنیفہؒ کی براہِ راست مرتب کردہ کتاب یہی ''کتاب الآثار'' ہے، اس کے علاوہ ''مسند ابی حنیفہؒ'' کے نام سے جو مختلف کتابیں ملتی ہیں، وہ خود امام صاحب کی تالیف نہیں ہیں، بلکہ آپ کے بعد بہت سے حضرات محدثین نے آپ کی مسندات تیار کیں، ان میں حافظ ابن عقدہؒ، حافظ ابونعیم اصفہانیؒ، حافظ ابن عدیؒ، حافظ ابن عساکرؒ مشہور ہیں، بعد میں علامہ خوارزمیؒ نے ان تمام مسانید کو ایک مجموعہ میں یکجا کر دیا، جو جامع مسانید الامام الاعظمؒ کے نام سے مشہور ہیں۔

(۲) **المؤطا للامام مالک** علیہ الرحمۃ: اس کتاب کو اپنے زمانے میں "**اصح الکتب بعد کتاب اللہ**" کہا جاتا تھا، اس کے بعد یہ لقب صحیح بخاری کو ملا، اس لئے کہ اس میں مؤطا کی تقریباً تمام احادیث بے شمار دوسری احادیث کے ساتھ موجود ہیں۔

(۳) **جامع معمر بن راشد** علیہ الرحمۃ: یہ بھی امام مالکؒ کے ہم عصر ہیں، اور اپنے دور میں اُن کی کتاب بہت مقبول ہوئی، مگر آج کل نایاب ہیں۔

(۴) **جامع سفیان ثوری** علیہ الرحمۃ: امام شافعیؒ نے اس کتاب سے استفادہ کیا ہے۔

(۵) **السنن لابن جریج** علیہ الرحمۃ: اسے ''سنن ابی الولید'' بھی کہتے ہیں۔

(۶) **السنن لوکیع بن الجراح** علیہ الرحمۃ

(۷) **کتاب الزھد لعبد اللہ بن المبارک** علیہ الرحمۃ

تیسری صدی ہجری میں تدوین حدیث

یہ صدی علم حدیث کی تدوین اور ترتیب کے لحاظ سے عروج کا زمانہ ہے، درحقیقت امہات الکتب اور صحاحِ ستہ اسی صدی میں مرتب ہوئیں، فن حدیث پر لکھی ہوئی کتابیں نئی ترتیب اور تبویب کے ساتھ وجود میں آنے لگیں اور کتب حدیث کی بیس سے زیادہ قسمیں ہوگئیں، اسماء الرجال اور جرح وتعدیل نے باضابطہ علم کی صورت اختیار کرلی، جو حدیث کی جانچ، پرکھ اور صحیح احادیث کو جمع کرنے

کے مقصد سے تھی۔ اسی صدی میں حدیث کی وہ چھ کتابیں بھی مرتب ہوئی ہیں، جن کے بارے میں امت اسلامیہ کا یقین ہے کہ ان میں موجود احادیث صحیح ہیں، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات محفوظ طریقے سے ان میں موجود ہیں۔

اس صدی اور اس کے بعد حدیث کی جو اہم کتابیں وجود میں آئیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) الجامع الصحیح للامام البخاری (۲) الجامع الصحیح للامام مسلم (۳) سنن النسائی۔

(۴) سنن ابی داؤد (۵) الجامع السنن للامام الترمذی (۶) سنن ابن ماجه

(۷) مسند ابی داؤد الطیالسی (۸) مسند الامام احمد بن حنبل (۹) مصنف عبد الرزاق۔

(۱۰) مصنف ابی بکر بن ابی شیبة (۱۱) المستدرك للحاکم (۱۲) المعاجم للطبرانی۔

(۱۳) المسند الکبیر للامام ابی بکر البزار (۱۴) مسند ابی یعلی (۱۵) سنن الدارمی۔

(۱۶) السنن الکبری للبیهقی (۱۷) سنن دارقطنی۔

چوتھی صدی ہجری اور اس کے بعد

تدوین حدیث کا سلسلہ چوتھی صدی میں بھی جاری رہا، اور نئی کتابوں کے علاوہ پرانی حدیث کی کتابوں کی نئی ترتیب بھی شروع ہوئی اور اس کے بعد حدیث کی کتابوں کی شروحات کا سلسلہ شروع ہوا جو اب تک جاری ہے۔

سقوط بغداد کے بعد علم حدیث کی خدمت بلادِ مغرب (اندلس، مراکش) اور بلادِ مصر میں جاری رہی، اور تصنیف وتالیف کے ساتھ درس وتدریس اور اشاعت کا کام برقرار رہا، یہاں تک کہ دسویں صدی ہجری کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ نے حدیث کی خدمت کے لیے بلادِ ہندوسندھ کو توفیق عطا کی، چنانچہ حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی اور ان کے تلامذہ نے اس میں بھرپور حصہ لیا، مگر صحاح ستہ کی تدریس اور حدیث پر مزید خدمت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کے خانوادہ وتلامذہ کی رہین منت ہے۔

غلو فی الدین کی حرمت وممانعت

مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی

غلو کی مذمت وممانعت قرآن میں

اسلام میں ''غلو فی الدین'' کی سخت ممانعت ہے اور قرآن کریم وحدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں اس کے دلائل موجود ہیں۔

یہاں صرف چند دلیلیں ذکر کی جاتی ہیں: سب سے پہلے قرآن کریم سے دلیل لیجئے:

(۱) پہلی آیت:

﴿قُلْ يَٰٓأَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ﴾ (المائدہ)

(اے اہل کتاب! اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور نہ ان لوگوں کی پیروی کرو، جو اس سے گمراہ ہو چکے اور بہت سے لوگوں کو گمراہ کر چکے اور سیدھے راستے سے بھٹک گئے۔)

(۲) دوسری آیت:

ایک اور جگہ قرآن میں ان ہی الفاظ کے ساتھ غلو کی ممانعت کی گئی ہے، چناں چہ فرمایا:

﴿يَٰٓأَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ﴾ (النساء)

(اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ پر حق بات کے سوا کچھ نہ کہو۔)

ان دونوں جگہ کی آیات میں یہود و نصاری کو غلو فی الدین سے منع کیا گیا ہے؛ کیوں کہ یہ دونوں اللہ کی قائم کردہ حدود کو ہمیشہ توڑتے رہے اور دین میں غلو کے ذریعے اپنے دینوں کو بدل دیا تھا؛ لہٰذا ان کو اس ناشائستہ حرکت و کافرانہ عمل سے منع کیا گیا۔ یہود نے حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیا اور عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا ٹھیرایا۔

مفسر قرآن علامہ قرطبی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

''مراد اس ''غلو'' سے جیسا کہ مفسرین نے بیان کیا ہے، یہود کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں غلو ہے؛ حتی کہ حضرت مریم علیہا السلام پر بہتان باندھ دیا اور مراد عیسائیوں کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں غلو ہے؛ یہاں تک کہ ان کو خدا ہی بناڈالا؛ لہٰذا افراط وتفریط دونوں ہی گناہ وکفر ہیں۔'')

(۳) تیسری آیت:

﴿فَاسْتَقِمْ كَمَآ أُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۚ إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝ وَلَا تَرْكَنُوٓا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُونَ ۝﴾ (ہود)

(آپ کو (راہِ دین پر) جس طرح استقامت کے ساتھ رہنے کا حکم دیا گیا ہے، اسی طرح استقامت سے رہیے اور وہ لوگ بھی استقامت سے رہیں، جو توبہ کر کے آپ کے ساتھ ہیں اور دین کے دائرے سے ذرا بھی نہ نکلو، بلاشبہ وہ اللہ تم سب کے اعمال کو خوب دیکھتا ہے اور تم ان لوگوں کی طرف مت جھکو، جنہوں نے ظلم کیا کہ کہیں تم کو دوزخ کی آگ لگ جائے اور اللہ کے سوا کوئی بھی تمہارا دوست نہیں ہے؛ پھر تمہاری مدد نہ کی جائے گی۔)

یہ دو آیات ہیں، ان میں سے پہلی آیت میں حضرت نبی کریم ﷺ کو اور تمام امتیوں کو دو حکم دیے گئے ہیں: ایک **(استقم)** (دین پر استقامت سے رہیے۔)

علامہ زمخشری رحمۃ اللہ نے اس کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا:

''**فاستقم استقامةً مثل الاستقامة التي أُمِرْتَ بها على جادة الحق غيرَ عادل عنها**''

(آپ جادۂ حق پر اس طرح قائم رہیے، جس طرح آپ کو حکم دیا گیا ہے، اس سے ذرا عدول نہ کیجیے۔)

اور دوسرا **(ولا تطغوا)** (دین کے دائرے سے نہ نکلیے) اور ''طغیان'' کے معنی بھی حد سے باہر نکلنے کے آتے ہیں اور وہ غلو کا ہم معنیٰ ہے۔

مفسر قرآن علامہ ابوالسعود رحمۃ اللہ نے اپنی تفسیر ''**إرشاد العقل السليم**'' میں اس کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا:

''**ولا تنحَرِفوا عما حُدَّ لَكُم بإفراطٍ أو تفريطٍ؛ فإن كِلا طرفي قصد الأمور ذميم**''

(افراط یا تفریط کر کے ان حدود سے انحراف نہ کرو، جو تمہارے لیے مقرر کر دی گئی ہیں؛ اس لیے کہ ان معاملات کے دونوں پہلو افراط وتفریط مذموم ہیں۔)

"**ولا تخرجوا عن حدود اللہ**۔ (اللہ کے حدود سے نہ نکلو۔)اور دوسری آیت میں حد سے نکلنے والوں کی جانب میلان و جھکاؤ نہ رکھنے کا حکم اور ان کی جانب جھکاؤ رکھنے پر جہنم کی وعید سنائی گئی ہے۔

ان آیات کی تفسیر میں مفسر جلیل و محدث عظیم حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ نے ''ترجمۂ شیخ الہند'' پر اپنے ''فوائد'' میں مختصر مگر جامع کلام کیا ہے، اس کا یہاں نقل کر دینا مناسب ہے، آپ پہلی آیت کی تفسیر لکھتے ہیں:

''آپ کو اور ان لوگوں کو جنہوں نے کفر وغیرہ سے توبہ کر کے آپ کی معیت اختیار کر لی اور حق تعالیٰ کی طرف رجوع کیا، احکام الٰہیہ پر نہایت پامردی اور استقلال کے ساتھ ہمیشہ جمے رہنا چاہیے۔ عقائد، اخلاق، عبادات، معاملات، دعوت و تبلیغ وغیرہ ہر چیز میں افراط و تفریط سے علیحدہ ہو کر توسط و استقامت کی راہ پر سیدھے چلے جاؤ، کسی معاملے میں افراط و تفریط کی جانب اختیار کر کے حد سے نہ نکلو اور یقین رکھو کہ حق تعالیٰ ہر آن تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔''

اور دوسری آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''پہلے (**ولا تطغوا**) میں حد سے نکلنے کو منع کیا تھا، اب بتلاتے ہیں کہ جو لوگ ظالم (حد سے نکلنے والے) ہیں، ان کی طرف تمہارا ذرا سا میلان و جھکاؤ بھی نہ ہو، ان کی موالات و مصاحبت، تعظیم و تکریم، مدح و ثنا، ظاہری تشبہ، اشتراکِ عمل، ہر بات سے حسبِ مقدور محترز رہو؛ مبادا آگ کی لپٹ تم کو نہ لگ جائے، پھر نہ خدا کے سوا تم کو کوئی مددگار ملے گا اور نہ خدا کی طرف سے کوئی مدد پہنچے گی۔'')

پھر یہاں ایک بات سمجھنے کی یہ ہے کہ یہ (**استقم**) اور (**لا تطغوا**) دراصل ایک دوسرے کی توضیح و تاکید ہیں؛ کیوں کہ استقامت یہ ہے کہ دین پر صحیح طریقے پر جم جائے اور جو اس طرح جم جائے گا، اس کو لازم ہے کہ دین کے دائرے سے باہر نہ نکلے۔

اسی بات کو قدرے تفصیل و توضیح کے ساتھ مفسر قرآن حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ نے بیان فرمایا ہے، چناں چہ اسی آیت کی تفسیر میں آپ لکھتے ہیں:

''رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور تمام مسلمانوں کو اس آیت میں اپنے ہر کام میں، ہر حال میں استقامت پر رہنے کا حکم فرمایا گیا ہے، ''استقامت'' لفظ تو چھوٹا سا ہے؛ مگر مفہوم اس کا ایک عظیم الشان وسعت رکھتا ہے؛ کیوں کہ معنی اس کے یہ ہیں کہ انسان اپنے عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق، معاشرت، کسبِ معاش اور اس کی آمد و صرف کے تمام ابواب میں اللہ جل شانہ کے قائم کردہ حدود کے اندر اس کے بتلائے ہوئے

راستے پر سیدھا چلتا رہے، اس میں سے کسی باب کے کسی عمل اور کسی حال میں ایک طرف جھکاؤ یا کمی زیادتی ہوجائے تو استقامت باقی نہیں رہتی''۔

آگے چل کر فرماتے ہیں: (**ولا تطغوا**) یہ لفظ ''طغیان'' سے بنا ہے، اس کے معنی حد سے نکلنے کے ہیں، جو ضد ہے ''استقامت'' کی؛ آیت میں استقامت کا حکم مثبت انداز میں صادر فرمانے پر کفایت نہیں فرمائی؛ بل کہ اس کے منفی پہلو کی ممانعت بھی صراحۃً ذکر کر دی کہ عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق وغیرہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی مقرر کردہ حدود سے باہر نہ نکلو کہ یہ ہر فساد اور دینی و دنیوی خرابی کا راستہ ہے۔''

(۴) چوتھی آیت:

﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿٢٢٩﴾﴾ (البقرۃ)

(یہ اللہ کی قائم کردہ حدود ہیں؛ لہٰذا اِن سے باہر نہ نکلو اور جو لوگ ان سے تجاوز کرتے ہیں، وہی در اصل ظالم ہیں۔)

اس آیت میں بھی وہی ''غلوّ'' اور ''تجاوز عن الحدود'' سے منع کیا گیا ہے اور غلو کرنے والوں کو ظالم کہا گیا ہے، جو اس ''غلو فی الدین'' کی مذمت و برائی جاننے کے لیے کافی ہے۔

غلو کی مذمت و ممانعت حدیث میں

قرآنِ کریم کے بعد اب آیئے دیکھتے ہیں کہ حدیثِ رسول ﷺ میں غلو کے بارے میں کیا کہا گیا ہے؟

(۱) حضرت عبداللہ بن عباسؓ یا ان کے بھائی فضل بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"**یا أَیُّهَا الناسُ! إیّا کم والغُلوَّ فی الدینِ، فإنه أَهلَكَ مَنْ کانَ قَبلَکُمُ الغُلوَّ فی الدینِ۔**"

(اے لوگو! تم دین میں غلو کرنے سے بچو؛ کیوں کہ تم سے پہلے لوگوں کو دین میں غلو ہی نے ہی ہلاک کیا تھا۔)

یہ بات اللہ کے رسول ﷺ نے ایک خاص موقعے پر ارشاد فرمائی تھی، وہ یہ کہ حج کے موقعے پر ''جمرات'' پر کنکریاں مارنے کے لیے آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ یا ان کے بھائی فضل بن عباسؓ سے فرمایا کہ کنکریاں چن کر لاؤ، وہ کنکریاں چن کر لائے، جو نہ بہت بڑی تھیں، نہ بہت چھوٹی، آپ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں! ایسی ہونی چاہئیں، اس جیسی کنکریوں سے ''جمرات'' پر رمی کرو، پھر یہ جملہ فرمایا تھا: ''دین میں غلو سے بچو؛ کیوں کہ تم سے پہلے لوگوں کو اسی نے ہلاک کیا تھا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ کنکریاں مارنے میں بھی طریق سنت کو چھوڑنا اور بہت بڑی یا چھوٹی کنکریاں مارنا غلو فی الدین میں داخل ہے۔

(۲) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین مرتبہ فرمایا:

"ألا هلك المتنطعون" (خبردار! غلو کرنے والے ہلاک ہوگئے۔)

''شارح مسلم'' علامہ نووی رحمۃ اللہ نے "المنهاج شرح مسلم" میں اور علامہ سیوطی رحمۃ اللہ نے "الديباج شرح مسلم" میں "متنطعون" کے معنیٰ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"أي المعمقون الغالون المجاوزون الحدود في أقوالهم وأفعالهم۔"

(یعنی وہ لوگ جو دینی باتوں اور کاموں میں تعمق وتشدد کرتے، غلو کرتے اور حدود سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔)

(۳) حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"لاتشَدِّدُوا على انفسكم، فيشدد عليكم، فإن قوماً شددوا على أنفسهم، فشدد الله عليهم، فتلك بقاياهم في الصوامع والديار۔"

(اپنی جانوں پر سختی نہ کرو کہ تم پر سختی نہ کردی جائے؛ کیوں کہ ایک قوم نے اپنی جانوں پر سختی کی، تو اللہ نے اس پر بھی سختی کردی، پس یہ ان ہی کے بقایا ہیں، جو ان گرجاؤں اور کٹیوں میں ہیں۔)

یہ تشدد اسی غلو کی ایک شکل ہے، اس سے ہمارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سختی سے منع فرمایا اور اس کو یہود ونصاریٰ کے راہبوں کا عمل قرار دیا۔

(۴) حضرت سہل بن حنیفؓ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"لاتشَدِّدُوا على انفسكم، فإنما هلك من كان قبلكم بتشديدهم على أنفسهم، وستجدون بقاياهم في الصوامع، والديارات۔"

(اپنی جانوں پر سختی نہ کرو؛ کیوں کہ تم سے پہلے لوگوں کی ہلاکت، ان کے اپنے اوپر سختی ہی کی وجہ سے ہوئی ہے اور تم ان کے بقایا لوگوں کو گرجاؤں اور کٹیوں میں پاؤ گے۔)

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنے اوپر اعمالِ شاقہ سے سختی نہ کرو، جیسے زندگی بھر روزہ رکھنا، پوری پوری رات عبادت کرنا اور عورتوں سے الگ رہنا وغیرہ؛ تاکہ اصل عبادت کرنے اور حقوق ادا کرنے میں کہیں ضعف نہ آجائے؛ کیوں کہ ایسا کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ خود سختی کردیتے ہیں یعنی ایسی عبادت فرض کردیتے ہیں، جو تم ادا نہ کرسکو اور مصیبت میں پڑ جاؤ، جیسا کہ بنی اسرائیل کی ایک قوم نے جب اس طرح کی سختیاں اپنے اوپر لاگو کرلیں، جیسے مشقت آمیز عبادات اور مشکل ریاضتیں اور بے پناہ مجاہدات، تو اللہ نے ان پر یہ پابندیاں لاگو کردیں۔

(۵) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ان کے پاس ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی کہ رسول اللہ ﷺ گھر میں داخل ہوئے اور پوچھا کہ کون عورت ہے؟ حضرت عائشہؓ نے بتایا کہ یہ فلاں عورت ہے، وہ اپنی نماز (کی کثرت) کا تذکرہ کررہی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کو رہنے دو، تم پر اتنا ضروری ہے، جتنا کہ تم طاقت رکھتے ہو، پس اللہ تعالیٰ ثواب دینے سے نہیں اکتاتے، جب تک کہ تم ہی اکتا نہ جاؤ۔

(۶) حضرت ابوثعلبہ خشنیؓ کی روایت ہے کہ حضرت نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا:

"إن الله فرض فرائض فلا تضیعوها، وحرم حرمات فلا تنتهکوها، وحد حدوداً فلا تعتدوها، وسکت عن أشیاء من غیر نسیان فلا تبحثوا عنها۔"

(بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے کچھ چیزوں کو فرض قرار دیا؛ لہٰذا تم انہیں ضائع نہ کرو اور اس نے کچھ چیزوں کو حرام ٹھیرایا، پس تم ان کی بے حرمتی نہ کرو اور اس نے حدود مقرر کردیں؛ لہٰذا تم ان سے تجاوز نہ کرو اور چند باتوں سے بغیر بھول کے سکوت فرمایا؛ لہٰذا تم ان کے بارے میں کھوج نہ کرو۔)

اس میں اللہ تعالیٰ کے مقرر فرض کو ضائع نہ کرنے اور اس کے بیان کردہ حرام کا ارتکاب کرکے اس کی بے حرمتی نہ کرنے اور اس کی مقرر کردہ حدوں کو نہ پھلانگنے کا حکم دیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ ہمیں یہی حکم ہے کہ ان سب کی محافظت کریں اور اسی کا نام ''استقامت'' ہے، جو ''غلو'' کی ضد ہے۔

(۷) حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"إن الدین یسر، ولن یشاد الدین أحد إلا غلبه، فسددوا، وقاربوا، وأبشروا، واستعینوا بالغدوة والروحة وشيء من الدلجة"

(بلاشبہ دین آسان ہے اور جس نے بھی دین میں تشدد و غلو کیا، تو دین ہی اس پر غالب ہوا، لہٰذا اعتدال و توسط کو اختیار کرو اور جس قدر طاقت میں ہو اتنا کرلو، اجر و ثواب کی بشارت لو اور صبح و شام اور رات کے اخیر حصے سے عبادت میں مدد لو۔)

اس حدیث میں یہ جو فرمایا: «لن یشاد الدین أحد إلا غلبه» اس کا مطلب علما نے یہ بیان کیا ہے کہ جو شخص دین میں غلو کرتے ہوئے تشدد وسختی اختیار کرے گا، تو دین چوں کہ آسان ہے، لہٰذا دین ہی غالب رہے گا اور وہ شخص ہار جائے گا؛ لہٰذا ایسی بے جا سختی وتشدد سے احتراز کرنا چاہیے۔

اور شراحِ حدیث نے اس حدیث کا مقصد ومنشا واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:

''صبح وشام اور رات کے اخیر حصے سے اوقاتِ نشاط مراد ہیں اور یہ مطلب ہے کہ عبادت ایسے اوقات میں کی جائے، جب آدمی کو نشاط حاصل ہو؛ تاکہ عبادت کا مزہ آئے، اس میں آپ ﷺ نے عبادت گزار سے ایک مسافر کی حیثیت سے کلام کیا ہے کہ جیسے مسافر کے لیے یہ اوقات، بہترین اوقات ہیں، جس میں وہ سفر کر سکتا ہے، اسی طرح عبادت والے کو بھی اس کا خیال رکھنا چاہیے اور اگر مسافر دن رات مسلسل چلتا رہے گا، تو عاجز آ جائے گا اور اس کا سفر منقطع ہو جائے گا۔''

(۸) حضرت ابو برزہ اسلمی ؓ سے روایت ہے کہ ایک بار وہ باہر نکلے، تو اللہ کے رسول ﷺ کو آتے ہوئے دیکھا اور یہ سمجھ کر کہ آپ اپنی ضرورت کے لیے جا رہے ہیں، اعراض کیا؛ مگر خود آپ ﷺ نے ان کو بلایا اور ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لے کر چلنے لگے، وہاں ایک شخص کو دیکھا، جو نماز پڑھ رہا تھا اور کثرت سے رکوع وسجدہ کر رہا تھا۔ آپ ﷺ فرمانے لگے:

«علیکم هدیاً قصداً، فإنه من یشاد هذا الدین یغلب»

(تم پر لازم ہے کہ درمیانی طریقہ اختیار کرو؛ کیوں کہ جو بھی دین میں تشدد وغلو کرتا ہے، اس پر دین ہی غالب آتا ہے۔) یہ تین مرتبہ فرمایا۔

(۹) حضرت انس ؓ کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ مسجد میں داخل ہوئے، تو دیکھا کہ ایک لمبی سی رسی دو ستونوں کے درمیان لٹکی ہوئی ہے، آپ ﷺ نے معلوم کیا کہ یہ رسی کیا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ حضرت زینب ؓ کی رسی ہے، جب وہ عبادت کرتے ہوئے تھک جاتی ہیں تو اس سے لٹک جاتی ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: اس کو کھول دو، تم میں سے کوئی نماز پڑھے، تو اپنی نشاط وسہولت کے مطابق پڑھے، جب تھک جائے تو سو جائے۔

(۱۰) حضرت عائشہ ؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إذا نعس أحدکم وهو یصلی فلیرقد، حتی یذهب عنه النوم فإن أحدکم إذا صلی وهو ناعس لا یدری لعله یذهب یستغفر فیسب نفسه»

(جب تم میں سے کسی کو نماز پڑھتے ہوئے اونگھ آ جائے، تو اس کو سو جانا چاہیے، یہاں تک کہ اس کی نیند جاتی رہے؛ کیوں کہ جب کوئی نیند کی حالت میں نماز پڑھے گا، تو کیا خبر وہ شاید استغفار کرنا چاہے اور خود کو گالی دینے لگے۔)

(۱۱) حضرت عبداللہ بن عباس ؓ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ اللہ کے رسول ﷺ خطبہ دے رہے تھے کہ ایک شخص کو دیکھا کہ وہ کھڑا ہوا ہے، آپ ﷺ نے پوچھا، تو لوگوں نے کہا کہ یہ ابو اسرائیل ؓ ہیں، انہوں نے نذر مانی تھی کہ وہ دھوپ میں کھڑے رہیں گے، نہیں بیٹھیں گے، کسی چیز کا سایہ نہیں لیں گے اور کسی سے بات نہیں کریں گے اور روزہ رکھیں گے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان کو حکم دو کہ وہ بات چیت کریں، سایہ حاصل کریں اور بیٹھیں اور روزہ کی نذر پوری کریں۔

(۱۲) حضرت انس ؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک بوڑھے شخص پر سے گزرے، جو اپنے دو بیٹوں کے سہارے چل رہا تھا، آپ ﷺ نے پوچھا کہ اس کا کیا حال ہے؟ بتایا گیا کہ اس نے کعبۃ اللہ تک چل کر جانے کی نذر مانی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: "إن الله عن تعذيب هذا نفسه لغني" (اللہ اس (بوڑھے) کے خود کو اس تکلیف دینے سے مستغنی ہیں) پھر آپ نے اس کو سوار ہونے کا حکم دیا۔

مذکورہ احادیثِ نبویہ سے یہ معلوم ہوا کہ دین میں غلو کرنا ناجائز ہے اور اس کی سخت ممانعت ہے۔

حضرت معاذ ؓ کہتے ہیں کہ (ایک سفر کے دوران سواری کے) گدھے پر میں آنحضرت ﷺ کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا، میرے اور آنحضرت ﷺ کے درمیان کجاوے کو پچھلا حصہ حائل تھا، آنحضرت ﷺ نے (مجھ سے) فرمایا معاذ ؓ! جانتے ہو بندوں پر اللہ کا کیا حق ہے؟ مں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا بندوں پر اللہ کا حق یہ ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں، اور اللہ پر بندوں کا یہ حق کہ جس نے کسی کو اللہ کا شریک نہ ٹھہرایا اسے عذاب نہ دے (یہ سن کر) میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! میں یہ خوشخبری لوگوں کو بتا دوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: لوگوں کو یہ خوشخبری نہ سناؤ کیونکہ وہ اسی پر بھروسہ کر بیٹھیں گے، (اور عمل کرنا چھوڑ دیں گے۔) (بخاری و مسلم)

پہلے انسان یا مسلمان؟

عقیدے کا ایک بنیادی سبق

صدیق مغل

''ہم پہلے انسان (ہیومن) ہیں اور پھر مسلمان، ہندو یا عیسائی وغیرہ''

یہ سیکولروں کی عوام الناس کو پھانسنے کی ایک دیرینہ خوشنما واہم دلیل ہے۔ اس دلیل کی اہمیت یہ ہے کہ سیکولرزم اس بات پر نہایت شدومد سے زور دیتی ہے کہ ایک عادلانہ معاشرتی تشکیل کے لیے ہمیں انسانیت کی سطح پر سوچنے کی ضرورت ہے نہ کہ کسی خاص مذہب، رنگ یا نسل وغیرہ کی بنیاد پر، یعنی معاشرے کی بنیاد ایسی قدر پر استوار ہونی چاہیے جو ہم سب میں مشترک ہے اور وہ اعلیٰ ترین اور بنیادی قدر مشترک شے اس کے نزدیک 'انسانیت' کے سوا کچھ نہیں ہوسکتی۔ اپنے اس دعوے ہی کی معقولیت ثابت کرنے کے لیے یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ

آیا پہلے اور اصلاً ہم انسان ہیں یا مسلمان؟

اس کے جواب میں ایک مرتبہ جب یہ مان لیا کہ سب کی بنیادی واصلی شناخت مسلمان وغیرہ ہونا نہیں، بلکہ یہ تو ثانوی شناختیں ہیں، تو یہی وہ تصور ہے جس کے ذریعے سیکولرزم مذہب کو فرد کا نجی مسئلہ بنا ڈالتی ہے، کیونکہ انسانیت کو اصل قرار دینے کے بعد زیادہ معقول بات یہی دکھائی دیتی ہے کہ اجتماعی نظام کی بنیاد ایسی شے پر قائم کی جائے جو سب کی اصل اور سب میں مشترک ہو؛ تا کہ زیادہ وسیع النظر معاشرہ وجود میں آسکے وغیرہ۔ اسی فکر کے تحت ہم اس قسم کے جملے سنتے ہیں کہ

ہمیں انسانیت کے پیمانے پر سوچنے کی ضرورت ہے۔

سب کے نظریات وخیالات کو عزت کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے کیونکہ سب لوگ انسان ہیں، وغیرہ۔

حیرت انگیز اور افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہمارے دینی مفکرین جب سیکولر حضرات سے گفتگو فرماتے ہیں تو انسانیت کی بنیاد پر اپنے دلائل قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس کی وجہ سے یا تو انھیں دوران گفتگو پے در پے شکست ہوتی چلی جاتی ہے اور یا وہ کمزور دلائل اور تاویلات کا سہارا لیتے دکھائی دیتے ہیں۔ در حقیقت انسانیت پرستی (ہیومن ازم) کو رد کیے بغیر مذہب کو اجتماعی زندگی میں شامل کرنے کی کوئی معقول علمی دلیل فراہم کرنا ممکن ہے ہی نہیں۔

اصلا مسلمان ہونے کا مطلب

آیئے ایک مرتبہ پھر اس سوال پر غور کریں کہ 'آیا پہلے اور اصلاً میں انسان ہوں یا مسلمان؟'۔

اس سوال کا واضح اور قطعی جواب یہ ہے کہ 'میری حقیقت اور اصل مسلمان (بمعنی عبد) ہونا ہے جبکہ انسان ہونا محض ایک حادثہ اور میری مسلمانیت (عبدیت) کے اظہار کا ذریعہ ہے'۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ میری اصل عبد یعنی اللہ تعالی کا بندہ ہونا ہے جبکہ میری انسانیت ایک حادثہ اور اتفاقی امر ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے یہ سوال اٹھائیں کہ اگر میں انسان نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ ایک صورت یہ ہے کہ میں جن یا فرشتہ ہوتا، دوسری صورت یہ ہے کہ میں حیوانات، جمادات یا نباتات کی اجناس سے تعلق رکھتا۔ مگر میں کچھ بھی ہوتا، ہر حال میں مخلوق ہوتا، یعنی اپنے وجود کی ہر ممکنہ صورت میں میری اصل مخلوق (عبد) ہونا ہی ہوتی، یہ اور بات ہے کہ میری عبدیت کا اظہار مختلف صورتوں میں ہوتا۔ مثلاً اگر میں پودا ہوتا تو میری عبدیت کا اظہار پودا ہونے میں ہوتی، اگر میں فرشتہ ہوتا تو یہ ملکوتیت میری عبدیت کے اظہار کا ذریعہ بنتی اور جب میں انسان ہوں تو میری انسانیت میری عبدیت کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ چنانچہ اس کائنات میں میرے وجود کا ایسا کوئی امکان نہیں جہاں میں اصلا خدا کے بندے کے ماسوا بھی کچھ اور ہوتا، میرا حال تو تبدیل ہوسکتا ہے لیکن میرا مقام بہرحال مخلوق (عبد) ہونا ہی رہے گا اور یہ بہرصورت ناقابل تبدیل ہے۔ پھر میرے وجود کی ہر حالت میرے لیے ان معنوں میں اتفاقی (contingent) ہے کہ میں اپنی کسی حالت کا خود خالق نہیں بلکہ اللہ تعالی نے جس حالت میں چاہا مجھے میری مرضی کے بغیر تخلیق کر دیا، نیز وہ اس بات پر مجبور نہ تھا کہ مجھے انسان ہی بناتا، یہ محض اس کا فضل ہے۔

پس یہ سوال کہ "اصلا مسلمان ہو یا انسان"، تو اس کا بالکل واضح جواب یہ ہے کہ میری اصل مسلمانیت (بمعنی عبدیت) ہے اور انسان اتفاقی طور پر ہوں نیز انسانیت میری مسلمانیت کے اظہار کا ذریعہ ہے، اس کے علاوہ میری انسانیت اور کچھ بھی نہیں۔ دوسرے لفظوں میں میں لازما being with God ہوں، نہ کہ اس سے ماوراء کوئی ہستی۔ اپنے انسان ہونے کو ڈیفائن کرنے کا میرے پاس اس کے علاوہ کوئی دوسرا حوالہ موجود نہیں، سوائے اس کے کہ میں خود مختاریت کا دعوی کروں۔ "میں کون ہوں"، اس سوال کا جواب میں جونہی خدا کے حوالے کے بغیر دینے کی کوشش کرتا ہوں میں لازما خود کو خدا سے ماوراء وماقبل وجود (being without God) فرض کرلیتا ہوں، اور یہی الحاد کی بنیاد ہے۔ خدا کا وجود میرے شعور انسانیت سے ماقبل ہے، لاالہ الا اللہ اسی بات کا اقرار ہے۔

جب یہ واضح ہو چکا کہ "میری اصل انسان ہونا نہیں بلکہ خدا کا بندہ (مسلمان) ہونا ہے" تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب ایمان اور کفر کی حقیقت بھی واضح کردی جائے نیز یہ بھی کہ خدا کا بندہ ہونا کیوں کر مسلمان ہونے کے ہم معنی ہے۔ عبدیت کو مسلمانیت سے اس لیے تعبیر کیا گیا کیونکہ اصلاً وحقیقتا ہر انسان خدا کا بندہ ہی ہے، چاہے وہ اس کا اقرار کرے یا انکار، کسی انسان کا اس حقیقت سے انکار کرنا کائنات میں اس کے حقیقی مقام کو بدل نہیں سکتا۔ اگر وہ زبان ودل سے اس حقیقت کا اقرار کرلے تو مؤمن ومسلم (اپنی حقیقت اور اصل کا اقرار کرنے والا اور تابعدار) کہلاتا ہے اور اگر انکار کرے تو کافر۔ یعنی کافر کفر کر کے کسی نئی حقیقت کو دریافت نہیں کرتا بلکہ اپنی حقیقت کا انکار کرتا ہے، اسی لیے تو "کافر" (حقیقت کو چھپانے و جھٹلانے والا) کہلاتا ہے۔

جب یہ واضح ہوا کہ اصلاً میں خدا کا بندہ ہوں تو اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ بطور انسان میں بندہ کیسے بنوں؟ تو اس کا جواب ہے "ان الدين عند الله الاسلام" (یعنی اظہار بندگی کا واحد اور معتبر طریقہ تمہارے رب کے نزدیک صرف اسلام ہے)، نیز "من يبتغ غير الاسلام دينا فلن يقبل منه" (یعنی جس کسی نے اپنی انسانیت کے اظہار کے لیے اسلام کے علاوہ کوئی طریقہ اختیار کیا تو ایسے طریقے سے ظاہر کی گئی انسانیت رب کے یہاں مقبول نہ ہوگی)۔ چنانچہ میری انسانیت معتبر (authentic) تب ہوگی جب میں اسے بندگی کے اظہار کا ذریعہ بناؤں، اور بندگی کے اظہار کا طریقہ جاننے کا معتبر طریقہ صرف وہ پیغام ہے جسے خدا نے اپنے آخری رسول ﷺ پر نازل کیا۔ اس ایک طریقے کے سواء اظہار بندگی کے سب طریقے مردود ہیں۔

پھر جب یہ واضح ہوا کہ میں خدا کا بندہ ہوں، تو خدا کا یہ بندہ میں تنہائی (پرائیویٹ لائف) میں بھی ہوں اور لوگوں سے تعلقات قائم کرنے کے بعد (پبلک لائف میں) بھی۔ یہ عقلی مخمصہ کسی طور قابل قبول نہیں ہوسکتا کہ تنہائی میں بطور انسان تو میں اور میری بیوی خدا کے بندے ہیں لیکن جونہی ہم تعلق قائم کر لیتے ہیں تو ہم خدا کے بندے اور اس کے حکم کی اطاعت کے پابند نہیں رہتے۔ ایسی بات صرف ایسا ہی انسان قبول کرسکتا ہے جو عقلی طور پر قلاش ہو چکا ہو۔ میں اگر واقعی خدا کا بندہ ہوں تو اپنی زندگی کی ہر حیثیت میں ہوں۔ اپنے سے باہر کسی غیر کو مخاطب کرنے کی میرے پاس اس کے سواء کوئی بنیاد و حوالہ ہی نہیں؛ نیز نہ ہی خدا کے نازل کردہ پیغام سے باہر میرے پاس حقوق کے تعین کا کوئی ایسا دائرہ ہے کہ جس میں خود کو رکھ کر میں کسی سے ہم کلام ہوسکوں۔ میں جب بھی کسی کو خطاب کرتا ہوں تو اس بنیاد پر کرتا ہوں کہ اس بابت خدا کا حکم مجھ سے کیا تقاضا کرتا ہے، میں جب بھی کسی غیر مسلم کو خطاب کرتا ہوں تو اسی حق کی طرف دعوت دیتا ہوں نہ کہ اس سے ماوراء حقوق کی کسی تفصیلات کے فریم ورک میں ان سے مکالمہ کرتا ہوں۔ چنانچہ میں کسی غیر مسلم کا حق زندگی اس لیے نہیں مانتا کہ" ہر انسان کو بطور مجرد انسان" کچھ ایسے فطری حقوق حاصل ہیں جن کی پابندی مجھ پر لازم ہے۔ ہرگز بھی نہیں، بلکہ ایسا اس لئے مانتا ہوں کیونکہ یہ خدا کا حکم ہے اور جس کی پاسداری مجھ پر لازم ہے۔ حق کے تعین کا حق نہ تو میں اپنی ذاتی زندگی میں رکھتا ہوں اور نہ اجتماعی زندگی میں۔ "محمد رسول اللہ" کے اقرار کا یہی مطلب ہے۔

اصلاً انسان ہونے کا مطلب

اب یہ جو ''مسلمانیت'' کے بجائے ''انسانیت'' کا حوالہ دیتے ہیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ ان کی اصل بات، جس کا خود ان میں سے بہت سوں کو بھی ادراک نہیں، آپ کے سامنے رکھ دی جائے۔ آپ ان سے پوچھئے کہ اچھا بتاؤ! مسلمان ہونے سے قبل انسان ہونے کا کیا مطلب ہے؟

دیکھیے مسلمان ہونے کا مطلب یہی ہے نا کہ میں اصلاً و حقیقتاً خدا کا بندہ ہوں۔

بتائیے کیا میری اس حقیقت سے ماوراء اور ماقبل بھی میری کوئی ایسی حقیقت ہے جس کا آپ مجھ سے اقرار کروانا چاہتے ہیں؟ دراصل یہ بات کہنے والوں کی عظیم ترین اکثریت کو اس بات کا مطلب ہی معلوم نہیں ہوتا۔

میں کون ہوں؟

فی زمانہ اس کے دو غالب جواب ہیں۔

ایک یہ کہ میں خدا کا بندہ (مسلمان) ہوں، دوسرا یہ کہ میں آزاد و قائم بالذات ہوں۔

مسلمان ہونے سے قبل انسان ہونے کی دعوت کا اصل مطلب اسی بات کا اقرار کروانا ہے کہ "میں اصلاً آزاد ہوں"۔ پھر یہ جو خود کو مسلمان وغیرہ سمجھا جاتا ہے تو یہ اس آزاد ہستی کے اپنے ارادے کے تحت اختیار کردہ اپنی ذات کے بارے میں کچھ تصورات ہیں جو اصل حقیقت نہیں، اصل حقیقت میرا وہ ارادہ ہے جو حقیقت تخلیق کرتا ہے۔ میں اپنے انسان ہونے کے بارے میں مختلف بنیادی حوالے رکھ سکتا ہوں، مثلاً ایک یہ کہ میں اصلاً و سب سے پہلے مغل ہوں، یا یہ کہ میں اصلاً پنجابی ہوں، یا یہ کہ میں اصلاً پاکستانی ہوں، یا یہ کہ میں اصلاً مزدور یا سرمایہ دار طبقے کا نمائندہ ہوں، یا یہ کہ میں اصلاً خدا کا بندہ ہوں۔ اپنی ذات کے ادراک کے لئے میں جو بھی حوالہ اختیار کرتا ہوں، اسی کی بقا و غلبے کے لئے جدوجہد کرنے کا سب سے مقدم اخلاقی جواز رکھتا ہوں۔

اس کے جواب میں یہ آپ سے کہیں گے کہ تم اصلاً یہ سب نہیں ہو، بلکہ یہ سب تو تمھاری اصل کا اظہار ہیں۔ اب آپ ان سے پوچھیے کہ بتاؤ پھر اصل میں، میں کیا ہوں؟ تو یہ آپ سے کہیں گے کہ اصل میں تم ایک آزاد و خود مختار (قائم بالذات) ہستی ہو جسے یہ حق ہے کہ وہ اپنے ارادے سے خیر کو متعین کرے۔ پس مسلمان ہونا یہ اصل نہیں بلکہ صرف اپنے ارادے کے تحت ایک خیر کو ڈیفائن کر لینا ہے۔ یہ واحد خیر نہیں بلکہ خیر کے لاتعداد تصورات میں سے بس ایک ہے۔ یعنی خدا کا حوالہ چھوڑ دو، زمین پر اپنے ارادے سے بنائے ہوئے خیر کے حوالوں کو اپناؤ، اسی کے لیے جدوجہد کرو۔ یہ ہے ان کے نزدیک انسان ہونے کا اصلی معنی، جس کا یہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اقرار کروانا چاہتے ہیں۔

پس عقیدے کے جن چند اسباق کا یہاں ذکر کیا گیا، انہیں خوب اچھی طرح سمجھ رکھنا چاہیے کیونکہ جدید الحاد نے عقیدوں میں جو اجاڑ پیدا کیا ہے، اس کا سبب اسی نوع کے خوشنما دعوے و اصطلاحات ہیں، جنھیں دہرا کر لوگ خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ اللہ سمجھنے کی توفیق عنایت فرمائے۔

❊ ❊ ❊

مؤمنین کے اوصاف و مدارج

امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؔ

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ۔

ترجمہ: توبہ کرنے والے، عبادت میں سرگرم رہنے والے، سیر و سیاحت کرنے والے، رکوع وسجود میں جھکنے والے، برائی سے روکنے والے اور اللہ کی ٹھہرائی ہوئی حد بندیوں کی حفاظت کرنے والے۔

مندرجہ بالا آیت مہمات معارف میں سے ہے، فرمایا: سچے مومنوں کے اوصاف و مدارج یہ ہیں:

(ا) **التائبون**: یعنی وہ جو اپنی توبہ میں سچے اور پکے ہوتے ہیں اور ہر حال میں اللہ کی طرف رجوع کرتے اور غفلتوں اور لغزشوں پر نادم رہتے ہیں۔

(ب) **العابدُون**: یعنی وہ جو اللہ کی عبادت میں سرگرم رہتے ہیں اور ان کی ساری بندگیاں اور نیازمندیاں صرف اسی کے لئے رہتی ہیں، اور انکساری بھی ہے، اسی طرح عام اور خاص بھی۔ خاص یہ کہ خاص وقتوں اور خاص شکلوں کی عبادت جو دین حق نے قرار دے دی ہے، اسے پورے اخلاص اور خشوع اور خضوع کے ساتھ ادا کرے، عام یہ کہ انسان کی فکری حالت عبادت گذارانہ ہو جائے اور پھر وہ جو کچھ بھی سنے، جو کچھ بھی کرے سب میں ایک عابدانہ روح کام کر رہی ہو۔

(ج) **الحامدون**: یعنی وہ جو اپنی فکر سے اور اپنے قول سے اللہ کی حمد اور ستائش کرنے والے ہیں۔ فکر سے حمد و ستائش یہ ہوتی ہے کہ بحکم: **ویتفکرون فی خلق السمٰوٰت والارض** (۳:۹۱) آسمان وزمین کی خلقت میں غور و فکر کرنا اور ان تمام کارفرمائیوں کی معرفت حاصل کرنا جو اس کی محمودیت و جمال پر دلالت کرتی ہے، کیوں کہ جس ہستی کی محمودیت دل و دماغ میں بس جاوے گی، ضروری ہے کہ زبان سے بھی بے اختیار اس کی حمد و ثنا کے ترانے نکلنے لگیں۔

(د) السائحُون: وہ جو راہ حق میں سیر وسیاحت کرتے ہیں یعنی بحکم :قدخلت من قبلکم سنن فسیروا فی الارض (۱۳۷/۳)

زمین میں عبرت ونظر کے لئے گردش کرتے ہیں، علم کی ڈھونڈ میں نکلتے ہیں، راہِ حق میں جد وجہد کرتے ہوئے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ کا رخ کرتے ہیں، حج کے لئے خشکی وتری کی مسافتیں طے کرتے ہیں۔

الراکعون الساجدون: وہ اللہ کے سامنے جھک جاتے ہیں اور رکوع وسجود کی حالت جسم پر طاری ہوتی ہے اور زبان پر بھی طاری ہوتی ہے۔

الآمرون بالمعروف والناھون عن المنکر: وہ جو نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں، یعنی صرف اپنے ہی نفس کی اصلاح پر قانع نہیں ہو جاتے بلکہ دوسروں کو بھی اصلاح کرنے اور دنیا میں حق وعدالت کے نشر وقیام کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

الحافظون لحدود اللہ: یہ آخری وصف ہوا یعنی وہ جو ان تمام حدود کی حفاظت کرنے والے ہیں جو اللہ نے انسان کے لئے ٹھہرادی ہیں، قرآن کی اصطلاح یہ ہے کہ تمام واجبات وحقوق کو خواہ افراد کی زندگی سے تعلق رکھتے ہوں، خواہ جماعت سے؛ وہ حدود اللہ سے تعبیر کرتا ہے، یعنی یہ حدیں ہیں، جو مقرر کر دی گئی ہیں، ان کے ٹوٹنے میں انسانی امن وسعادت کی بنیادوں کا ٹوٹ جانا ہے۔

یہ کل سات وصف ہوئے اور جس ترتیب سے بیان کئے گئے ہیں وہ قابل غور ہیں، یہ گویا نفس انسانی کے تزکیہ وترقی کے لئے سات درجے ہیں، یا سات طبقے ہیں جو یکے بعد دیگرے ٹھیک اسی ترتیب سے سلوک ایمانی میں پیش آتے ہیں۔

جب کوئی انسان راستی وہدایت کی راہ میں قدم اٹھائے گا، تو قدرتی طور پر پہلا مقام توبہ وانابت کا ہی ہوگا، یعنی غفلتوں اور گمراہیوں سے خواہ وہ کفر کی ہوں، خواہ نفاق کی، خواہ معاصی وضلالت کی، باز آئے گا۔ اور آئندہ کے لئے ان سے بچنے کے لئے عہد کرے گا، یہی توبہ کی حقیقت ہے، پھر اگر توبہ سچی ہوگی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ کی بندگی و نیازمندی کی سرگرمی پیدا ہو جائے، پس یہ دوسری منزل ہوئی، یا سلوک ایمانی کا دوسرا درجہ، پھر چونکہ عبادت گذاری کی زندگی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ فکر اور ذکر کا مقام حاصل ہو جائے اور ملك السمٰوت والارض کے مشاہدۂ فطرت کا دروازہ کھل جائے، اس لئے تیسری منزل تحمید وتسبیح کی منزل ہوئی، یعنی اللہ کی حمد وثنا کے جوش سے

معمور ہو جانے کی منزل کہ ربنا ما خلقت ھذا باطلا ۔ پھر اگر توبہ و انابت کا تنبہ، عبادت کا ذوق، اور تحمید و تسبیح کا عرفان کامل درجہ کا ہے، تو ممکن نہیں کہ مومن صادق کو گھر میں چین سے بیٹھنے دے، ضروری ہے کہ وطن و مکان کی الفت کی زنجیریں ٹوٹیں اور سیر و سیاحت میں قدم سرگرم ہو جائیں، پس یہ چوتھی منزل ہوئی اور السائحون کا طبقہ چوتھا طبقہ ہوا۔

ان چار منزلوں سے جو کاروانِ عمل گذر گیا، اس نے اصلاحِ نفس کی مسافت طے کر لی، پس اب پانچویں منزل الراکعون الساجدون کی ہوئی، یعنی بندگی و نیاز مندی میں پورے ہو گئے اور اللہ کے آگے سر نیاز ہمیشہ کے لئے جھک گیا۔ اب آمرون بالمعروف والناھون عن المنکر کا مقام انہیں حاصل ہو جائے گا، یعنی اپنی تعلیم و تربیت کا معاملہ پورا کر کے دوسروں کے لئے معلم و مربی ہو جائیں گے؛ چناں چہ چھٹی منزل یہی ہوئی اور اسی سے آخری منزل کے ڈانڈے مل گئے کہ الحافظون لحدود اللہ کا مقام کیا ہے، یہاں پہنچ کر ان کے تمام اعمال حدود اللہ کی کامل نگہداشت کرتے ہیں اور اپنے اعمال میں بھی حدود اللہ کی کامل نگہداشت کرتے ہیں، اپنے وجود سے باہر بھی ان کے نفاذ و قیام کی نگہبانی کرتے ہیں۔

اس آیت سے یہ بات واضح ہوگئی، کہ نیک مقصد سے سیر و سیاحت کرنا سچے مومنون کا بہترین عمل ہے اور ان اعمال میں سے ہے جن کے ذریعے سے وہ ایمان کے مدارج طے کرتے اور خصائصِ ایمانی میں کامل ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ جس سرعت کے ساتھ صدر اول کے مسلمان تمام دنیا میں پھیل گئے اس کی کوئی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی اور جب تک اسلام کی عملی روح زندہ رہی، ان سے بڑھ کر زمین پر مسافتیں طے کرنے والی کوئی قوم نہ تھی اور سیاحت کو سیاحت سمجھ کر نہیں کرتے تھے؛ بلکہ اللہ کی عبادت سمجھتے تھے۔ اور فی الحقیقت سیاحت نہ صرف ایک تنہا عبادت ہے؛ بلکہ کتنی ہی عبادتوں کا مجموعہ ہے، گھر بار چھوڑنا، عزیز و اقارب کی جدائی برداشت کرنا، سفر کی مشقتوں میں پڑنا، قدم قدم پر مال خرچ کرنا، آب و ہوا کی ناموافقت، اجنبیوں سے محبت و معاملت اور پھر ان تمام موانع و مشکلات میں عزم و عمل کا استوار رہنا ایثار و تحمل سے کتنے مرحلے طے کرنے پڑتے ہیں، تب کہیں جا کر یہ عمل انجام پاتا ہے۔

سورۂ تحریم میں یہی وصف عورتوں کے لئے بھی فرمایا: "مومناتٍ قانتاتٍ تائباتٍ عابداتٍ سائحاتٍ" (۶۶:۵) اللہ کی فرماں بردار، برائیوں سے پرہیز کرنے والیاں، عبادت

گذار، سیاحت میں سرگرم، روایات سے ثابت ہے کہ نہ صرف صحابہ کرام کی بیویاں بلکہ پیغمبرؐ اسلام کی ازواج مطہرات بھی جنگ میں نکلتی تھیں اور مجاہدین کی خدمت کرتی تھیں، بعد کو اس بارہ میں جو حال رہا وہ شرح بیان سے مستغنی ہے۔

بعضوں کو اس پر تعجب ہوا کہ سیر وسیاحت کا شمار بھی خصائص ایمانی میں ہو، اس لئے **السائحون** اور **السّائحات** کے لغوی اور مصطلحہ معنٰی سے گریز کرنے لگے، لیکن فی الحقیقت ان کا تعجب محل تعجب ہے، قرآن حکیم نے ہجرت کو ایمان کا بہترین عمل قرار دیا ہے جو گھر بار چھوڑ کر نکلتا ہے، اور جہاد فی سبیل اللہ کے سلسلے میں فرمایا:۔

انفروا خفافا وثقالا (۹:۴۱) اور حج ہر مستطیع مسلمان پر مرد ہو یا عورت فرض کر دیا، جو باشندگانِ مکہ کے علاوہ سب کے لئے بڑی سیاحت ہی ہے۔

یاتین من کل فج عمیق (۲۲:۲۷) (۲۲:۲۷) نیز جا بجا زور دیا کہ ملکوں کی سیر کرو اور پچھلی قوموں کے آثار وباقیات سے عبرت کرو، ان کے عروج وزوال کے حالات وبواعث کی کھوج لگاؤ، خدا کی قدرت وحکمت کی ان نشانیوں پر غور کرو جو زمین کے چپہ چپہ میں پھیلی ہوئی ہیں اور اسی صورت میں یہ حکم پڑھو گے کہ طلب علم کے لئے گھروں سے نکلو اور علم کے مرکز میں پہنچو۔

فلولا نفر من کل فرقۃٍ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم (۹: ۱۲۲) اور تجارت کے سفر کو بھی فضل الٰہی کی جستجو سے تعبیر کیا، حتی کہ حج کے موقع پر بھی اس کی اجازت دے دی، **لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلاً من ربکم** کہ سیر وسیاحت کے یہ صریح احکام موجود ہیں تو پھر کونسی وجہ ہے کہ یہاں اس وصف کی موجودگی میں تعجب ہو!

> حضرت عبداللہ بن عمروؓ راوی ہیں، کہ رسول خدا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کامل مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان (کی ایذاء) سے مسلمان محفوظ رہے، اور اصل مہاجر وہ ہے جس نے ان تمام چیزوں کو چھوڑ دیا، جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے، یہ الفاظ بخاری کے ہیں، اور مسلم نے اس روایت کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے، ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا، کہ مسلمانوں میں سب سے بہتر کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جس کی زبان اور ہاتھ (کے ضرر) سے مسلمان محفوظ رہیں۔

سانحۂ برما: جھلستے جسم، تڑپتی لاشیں

مولانا فضیل احمد ناصری
استاذ حدیث جامعہ ہذا

پیشِ لفظ

اس وقت مسلمان بے حسی اور بے بسی کی آگ میں جس طرح جھلس رہا ہے، وہ دردناک ہے اور بڑی شرمناک۔ دیکھ دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے، ضمیر نام کی شے زندہ نہیں رہی، باہمی مودت اور شیفتگیٔ برہمن کے قدموں میں ہے۔ کہنے کو جسم ہے، مگر بے روح۔ آنکھیں ہیں، مگر بصارت سے خالی۔ دل ہے، مگر زندگی سے محروم۔ دماغ ہے، مگر قوتِ فکر و عمل سے ناآشنا۔ ان کی وہی حالت ہے، جو کسی دور میں منافقین کی تھی: اجسامهم كانهم خشب مسندة. کفار کے بارے میں قرآن نے کہا تھا: تحسبهم جميعا وقلوبهم شتىٰ دیکھنے میں یہ لوگ مجتمع، مگر درحقیقت ان میں انتشار۔ غور کی نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ ہمارا حال کافروں سے بھی بدتر ہے، ظاہراً بھی اجتماعیت مفقود اور باطناً بھی تفریق در تفریق۔

خونِ مسلمان کی قیمت

عالمِ اسلام کے ان بدترین مناظر کا سبب خونِ مسلم کی ارزانی ہے۔ دوسروں کو تو کیا کہیے، خود اپنے بھی اپنوں کی قیمت سے واقف نہیں، حالاں کہ حدیث کی دو اہم ترین کتب: بخاری اور مسلم میں ہے: قال رسول الله ﷺ لا يحل دم امرء مسلم يشهد ان لا اله الا الله وانی رسول الله۔ جو مسلمان گواہی دے کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں، اس کا خون بہانا حلال نہیں۔ اسی بخاری اور مسلم کی ایک حدیث میں اسامہ ابن زید کی روایت سے یہ آیا ہے کہ قبیلہ جہینہ کے ایک آدمی پر میں جھپٹ پڑا اور اس پر نیزہ سے حملہ کرنا چاہا تو اس نے کلمہ پڑھ لیا، تاہم میں نے اسے نہیں چھوڑا اور مار ڈالا، جب

میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آیا اور قصے کی تفصیل دی تو آپ نے اظہارِ افسوس کرتے ہوئے فرمایا: تم نے ایک کلمہ خواں کو کیوں کر قتل کر ڈالا؟ میں نے کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اس کی کلمہ خوانی کا مقصد مسلمان ہونا نہیں، جان بچانا تھا، آپ نے ناراض ہو کر فرمایا: فهلا شققت عن قلبه؟ تم نے اس کا دل چیر کر ہی کیوں نہ دیکھ لیا؟ پیغمبر علیہ السلام کی یہ ناراضگی تو اپنی جگہ ہے ہی، مسلم شریف کی حدیث میں تو یہاں تک بتایا گیا ہے: کیف تصنع بلا اله الا الله اذا جاءت یوم القیامة قاله مراراً۔ قیامت کے دن کلمہ طیبہ اگر اپنے پڑھنے والے کی طرف سے کھڑا ہو گیا اور بارگاہِ الٰہی میں اس نے تجھ پر مقدمہ کر دیا تو کیا کرو گے؟ یہ حدیث حضرت عبداللہ بجلیؓ سے منقول ہے اور کس قدر وعید آمیز!!

مردِ مؤمن خالقِ کائنات کی نظر میں

ہم کیا اور ہماری سوچ کیا۔ محدود ذات اور محدود عقل۔ مسلمان کی اہمیت ہم کیا جانیں، کائنات کیا جانے کہ ایمان والے کا مقام کیا ہے؟ یہ تو انہیں دھرتی کا بوجھ خیال کرتے ہیں، مگر دنیا بنانے والے کی نظر سے اس مسلمان کو دیکھیے تو چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔ صحابیٔ رسول حضرت عبداللہ بن عمرو سے منقول ہے: قال رسول اللہ ﷺ: لزوال الدنیا اھون علی اللہ من قتل رجل مسلم (رواہ الترمذی) اللہ تعالیٰ کی نظر میں دنیا کا ختم ہو جانا ایک مردِ مومن کے قتل ہو جانے سے زیادہ سہل ہے، یعنی دنیا کو تباہ و برباد کر دینا جتنا بڑا جرم ہے، اس سے بھی بڑا جرم ایک مسلمان کو مار ڈالنا ہے۔ قرآن میں یہی بات کچھ اس طرح بیان ہوئی ہے: من قتل نفسا بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعا ومن احیاھا فکانما احیا الناس جمیعا، اسی سے ملتی جلتی ایک حدیث حضرت ابوسعید خدری سے منقول ہے، آپ اسے درج بالا آیت قرآنی کی تفسیر بھی کہہ سکتے ہیں: قال رسول اللہ ﷺ: لو ان اھل السماء والارض اشترکوا فی دم مؤمن لا کبھم اللہ فی النار (رواہ البخاری) بفرضِ محال اگر زمین و آسمان کے سارے لوگ ایک مسلمان کے قتل میں ملوث ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ ان سب کو جہنم میں پھینک دیں گے۔ اس سے ایک مسلمان کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے، یہ ہرگز نہ بھولیے کہ قیامت کے دن سب سے پہلا سوال قاتل سے یہی ہوگا کہ تم نے فلاں کا خون کیوں بہایا تھا؟ یہ ارشادِ رسول بھی ہمیشہ ذہن میں رہے: من اشار الی اخیه بحدیدة فان الملائکة تلعنه حتیٰ یضعها وان کان اخاه لابیه وامه (البخاری) جس نے اپنے مسلمان بھائی کی طرف لوہے سے تیار اوزار سے اشارہ کیا تو اس

پر فرشتے اس وقت تک لعنت بھیجتے رہتے ہیں جب تک وہ اسے رکھ نہ دے، چاہے وہ اس کا حقیقی بھائی ہی کیوں نہ ہو۔ حضرت ابو ہریرہ نے یہ حدیث بھی ہم تک پہونچائی ہے: قال رسول اللہ ﷺ: من حمل علینا السلاح فلیس منا (البخاری) جو شخص (ہنسی مذاق میں بھی) ہم پر ہتھیار اٹھائے اس کا تعلق ہماری جماعت سے نہیں۔ یہ تو یاد ہی ہوگا کہ یہ دنیا مسلمانوں کے لیے ہی آباد کی گئی ہے، جس دن مسلمان نہ رہے وہی قیامت کا دن ہوگا، ارشادِ پیغمبر ہے: لا تقوم الساعۃ حتیٰ یقال فی الارض اللہ اللہ۔

برمی مسلمانوں کی حالتِ زار

مسلمان یوں تو ہر جگہ پریشان ہیں۔ ملک کوئی سا ہو: یمن ہو، عراق ہو، شام ہو، لیبیا ہو، مصر ہو، پاکستان ہو، یا پھر ہندوستان۔ پوری دنیا میں اس کا ناطقہ بند ہے۔ بدقسمتی سے اس وقت ہم میں چند در چند بیماریاں بھی پیدا ہوگئی ہیں، ان میں اسلامی اخوت اور دینی حمیت کے ساتھ حافظے کی خرابی سب میں نمایاں ہے، ہمارے ساتھ ہونے والا ہر واقعہ بہت جلد ذہنوں سے محو ہو جاتا ہے، ہم تکلیفیں بھول کر پھر مصروفِ لذت ہو جاتے ہیں اور خونِ شہیداں کی لالی قصۂ پارینہ بن جاتی ہے۔

یمن، شام، مصر اور فلسطین میں پے بہ پے حالات دردناک رہے، ہماری رگِ حمیت ''زندگی'' کے آثار سے بے خبر رہی، اب تازہ المیہ برما کا سانحہ ہے، برما کے روہنگیائی مسلمان ان دنوں حیات کے جس عذاب سے گزر رہے ہیں، اس کے تصور سے ہی پورا وجود ہل جاتا ہے، مظالم کا کون سا طریقہ ہے جسے چھوڑ دیا گیا؟ بدھسٹ نے سفاکیت کی سیاہ تاریخ رقم کر ڈالی، آگ کی سزا دینے سے مسلمان کو روکا گیا ہے، ترمذی شریف میں اسی کثیر الروایہ صحابی حضرت ابو ہریرہ سے مروی حدیث ہے: بعثنا رسول اللہ ﷺ فی بعث فقال: ان وجدتم فلانا وفلانا لرجلین من قریش فاحرقوھما بالنار ثم قال رسول اللہ ﷺ حین اردنا الخروج انی کنت امرتکم ان تحرقوا فلانا وفلانا بالنار وان النار لا یعذب بھا الا اللہ فان وجدتموھما فاقتلوھما (الترمذی) یعنی آگ سے عذاب دینے کا حق صرف اللہ کو ہے، بندے کو نہیں۔ حضرت علی نے خوارج سے تنگ آکر انہیں آگ میں جلا دیا، یہ خبر حضرت عبداللہ ابن عباس تک پہونچی تو کہنے لگے: اگر میں ہوتا تو نہ جلاتا، کیوں کہ پیغمبر ﷺ فرمایا ہے: لا تعذبوا بعذاب اللہ۔ مگر ستم ظریفی تو دیکھیے کہ جو لوگ اسلام کو دہشت گردی کا مذہب کہتے نہیں تھکتے، ان کے یہاں آتش زنی، خون ریزی اور بمباری عینِ صواب ہے۔ نوعیت بدل کر ہی سہی، یہی ہتھیار برمی

مسلمانوں پر بھی آزمائے گئے، ان کے مکانوں کو نذرِ آتش کرکے ان کے مکینوں کو انہیں میں جھونک دیا گیا، لوگوں کو رسیوں میں باندھ کر ان پر پٹرول چھڑک دیا گیا، اس کے بعد آگ کی جلوہ نمائی۔ پٹک پٹک کر ان پر یوں چھریاں چلائی گئیں، گویا قربانی کے جانور پر ایام اضحیہ چل رہے ہوں، کشتوں کے پشتے لگادیے گئے، جلی ہوئی لاشوں کا انبوہِ کثیر۔ بدھسٹ اپنے دھارمک لباس اور شناخت میں نمرودی افعال انجام دیتے رہے، حکومت اپنی خاموش تائید سے اس آگ کو بھڑکاتی رہی، مظالم کا یہ سلسلہ جو 1784 سے چلا تھا، بڑھتے ہوئے ہر دن کے ساتھ تشدد کی نئی نئی وارداتوں کی رونمائی کرگیا، یہ بے چارے آج بھی چیخ رہے ہیں، فریاد کررہے ہیں، رحم کی بھیک مانگ رہے ہیں، بے سروسامانی کی دہائی دے رہے ہیں، مگر وہی ہورہا ہے جو ان کے ساتھ ہوتا رہا ہے: قتل، غارت گری، عصمت دری، دربدری اور نقلِ مکانی کی اذیتیں۔

دنیا کے سب سے بڑے مظلوم

انسانی تاریخ کا یہ سیاہ باب بھی پڑھ لینا چاہیے کہ برمی مسلمان روئے زمین کے مظلوم ترین مسلمان ہیں، یہ بات کوئی دوسرا کیا کہے گا، خود اقوام متحدہ کہہ رہی ہے، ۱۹۶۲ء سے ان کا عرصۂ حیات تنگ تر ہوچکا ہے، ۲/ مارچ ۱۹۶۲ء میں برمی آرمی نے برما میں مارشل لا لگادیا تھا، جس کے بعد ڈکٹیٹر اور اس کے ہم خیال بدھسٹوں نے مسلمانوں کی املاک لوٹ لیں، ان کے بینک اکاؤنٹ منجمد کردیئے، کاروبار پر قبضہ کرلیا، ان کے بڑے بڑے گھروں کو سرکاری تحویل میں لے لیا، خوش حال مسلمانوں کا صرف یہی حشر نہیں ہوا؛ بلکہ انہیں دار ورسن کی رسم بھی ادا کرنی پڑی، نتیجتاً ان کی بڑی تعداد نے انڈیا، پاکستان، تھائی لینڈ اور بنگلہ دیش کو ہجرت کیا، پھر یہاں سے دنیا کے دوسرے ممالک کی راہ لی، ہجرت کرنے والوں کا جو نقصانِ عظیم ہوا، سو ہوا، رہ جانے والوں کا جینا حرام ہوگیا، ایسے ایسے قوانین بنے کہ مسلمان چکراہ کررہ گئے، سب کے لئے شناخت نامہ جاری ہوا، مگر مسلمانوں کو اس سے محروم کردیا گیا، برمی قانون کے مطابق جس کے پاس شناختی کارڈ موجود نہیں، وہ گویا نظر بند ہے، دن کی روشنی میں صرف اپنے شہر میں گھوم سکتا ہے، محنت مزدوری کے علاوہ معمولی کاروبار بھی کرسکتا ہے، لیکن رات گزارنے کے لئے اپنے گھر واپسی لازم ہے، رات کے اوقات میں وہ اپنے قریب سے قریب رشتہ دار سے بھی پولیس کو اطلاع دیئے بغیر نہیں مل سکتا، اگر کوئی شخص بلا اجازت اپنے کسی عزیز کے گھر میں ٹھہر گیا اور پولیس تک خبر پہنچ گئی تو مہمان اور میزبان دونوں زیر عتاب ہوں گے، جرمانے بھی دیں گے اور ایک ماہ کی جیل بھی۔

ارکانی مسلمانوں کا حال تو اور بھی بُرا ہے، ان کے لئے سرکاری ملازمت ممنوع ہے، یہ اسٹیٹ فری اسکولوں میں اپنے بچوں کو داخل نہیں کرواسکتے، ان کے نوے فی صد سے زیادہ عوام کا یہ حال ہے کہ انہوں نے اپنے صوبہ کے بقیہ اضلاع کا منہ تک نہیں دیکھا، ممکن بھی ہو تو کیوں کر! سفر کے لئے انہیں دو کڑے مرحلے عبور کرنے ہوتے ہیں: کسی بدھسٹ کی سفارش اور بھاری رشوت، اور یہ دونوں کام ان غریبوں کے مقاصد میں سدِّ راہ ہیں۔ ۱۹۷۸ء ان کے لئے پھر قیامت لے کر آیا، چند مسلمانوں نے ان مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تو ان پر مصائب کے پہاڑ توڑ دیئے گئے، سیکڑوں کو شہید کر دیا گیا، ہزاروں نذرِ زنداں ہو گئے، ہزاروں کا پتہ ہی نہ لگا، دو لاکھ سے زائد لوگ سمندری راستہ سے بنگلہ دیش چلے گئے، پھر وہاں سے تھائی لینڈ، ملیشیا، انڈونیشیا اور سعودی و پاکستان سمیت دیگر ممالک کا رخ کر لیا۔

۱۶/مارچ ۱۹۹۷ء کو یہ ارکانی مسلمان پھر حوادث سے دوچار ہوئے، بدھ انتہا پسندوں نے ان کی نسل کشی کا گھناؤنا کھیل ایک بار پھر کھیلا، جانوں کے زیاں کے ساتھ اسلامی تقدسات کو بھی انہوں نے ہدف بنایا اور ہجرت پر مجبور کیا۔ ۱۵/مئی سے ۱۲/جولائی ۲۰۱۲ء کے درمیان ایک اور قیامت سے انہیں گزرنا پڑا، بدھسٹوں نے ایک مسجد پر حملہ کر کے اس کے نمازیوں کو شہید کر دیا، حالات بد سے بدتر ہوئے، نتیجتاً کم وبیش ۲۰۰/مسلمانوں نے اپنی قیمتی جانیں گنوائیں، مئی ۲۰۱۲ء میں ایک بدھسٹ لڑکی کو اسلام لانے کی پاداش میں موت کے گھاٹ تو اتارا ہی، اگلے مہینے ۳/جون کو عمرہ کر کے آرہے بس پر سوار ۱۰/علماء پر حملہ کر دیا اور سب کو شہید۔ برطانوی ٹی وی چینل کی رپورٹ کے مطابق اس بلوے میں تقریباً دس ہزار مکانات ملبہ کے ڈھیر میں تبدیل کر دیے گئے اور ۸۰/ہزار مسلمانوں نے اپنا گھر بار چھوڑا، ۲۰۱۳ء میں مسلمانوں کی تعداد کم کرنے کے لئے ملک کے دو صوبوں میں ایک سے زیادہ بچے پیدا کرنے پر پابندی لگا دی گئی، ان پر حملے بھی ہوتے رہے، یہ کام وہ بدھسٹ کر رہے تھے اور تا حال کر رہے ہیں، جن کے فلسفے میں ایک جانور کا قتل، آدم کشی کے مترادف ہے، یہاں ۱۹۶۲ء سے ۲۰۱۱ء تک فوجی حکومتیں رہیں اور یہ حکومتیں مسلمانوں پر ستم کوشی کرتی رہیں، ۲۰۱۱ء سے یہاں اب جمہوری حکومت ہے، ۱۹۹۱ء میں امن کی ''نوبل انعام یافتہ'' آنگ سان سوچی ۲۰۱۵ء سے اس کی سربراہ ہے، آکسفورڈ یونیورسٹی سے فلاسفی، سیاست اور اکنامکس کی ڈگریاں بھی اس نے لے رکھی ہیں، یہ مغرب کی نظر میں ''دی لیڈی'' کہلاتی ہے، لوگ یہی سمجھ رہے تھے کہ اس کی حکومت میں مسلمانوں کو آسودگی ملے گی، مگر جو بات ایک دفعہ بگڑ جاتی ہے، اسے سدھارنا مشکل ہو جاتا ہے، یہی برما میں ہو رہا ہے۔

بے رحم پڑوسی

روہنگیائی مسلمان ان عرب مبلغین کی اولاد ہیں، جو تیسری صدی ہجری میں برما کے ساحلی علاقوں میں سمندر کے راستے سے آئے اور یہیں کے ہو رہے، ان کا موجودہ آبائی وطن ''ارکان'' ہے، یہ اس وقت برما کا ایک صوبہ ہے، جس میں کل پانچ اضلاع ہیں، اس کا کل رقبہ ۳۶۷۷۸ مربع کلومیٹر ہے، اس کی کل آبادی ۲۰۱۴ء کی حکومتی مردم شماری کے مطابق ۳۲/لاکھ افراد پر مشتمل ہے، یہاں ۵۲/فی صد بدھ، ۴۲/فی صد مسلمان، ۱/فی صد عیسائی، ۵/فی صد ہندو اور دو فی صد آٹھ اعشاریہ دیگر اقوام ہیں۔ یہ کسی زمانے میں ایک الگ ملک تھا، غالب اکثریت مسلمانوں کی تھی، 1784 میں اس پر برما کا قبضہ ہوا، ٹھیک سو برس کے بعد 1884 میں برطانیہ کے تسلط سے برما آزاد ہوا تو ارکان کو برمانے اپنے ساتھ پھر ملا لیا، ارکان برمی مسلمانوں کا اصلی وطن ہے، ان کا جرم اتنا ہے کہ یہ مسلمان ہیں، یہ اس پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مانتے ہیں جن کے بعد نبوت کا سلسلہ ختم ہے، یہ بت پرستی نہیں کرتے، یہ چوری نہیں کرتے، یہ یوم آخرت اور روزِ جزا پر ایمان رکھتے ہیں، یہی ان کا جرم ہے، اس جرم کی پاداش میں بدھسٹ کی تازہ کارروائی میں 30 ہزار سے زیادہ لوگ شہید ہو چکے، پانچ لاکھ سے زیادہ افراد ہجرت پر مجبور ہیں، ضاقت علیھم الارض بما رحبت زمین اپنی کشادگی کے باوجود ان پر تنگ بنی ہوئی ہے، ان کے لیے بنگلہ دیش کی سرحد برسوں بند رہی، اب بڑی حد تک کھل چکی ہے، سب سے زیادہ مہاجرین وہیں آباد ہیں۔ تھائی لینڈ نے اپنے دروازے مقفل کر رکھے ہیں، یہ جائیں تو کہاں جائیں؟ کشتی کے سہارے کسی ساحل کا رخ کرتے ہیں تو سمندر کی اچھلتی ہوئی موجیں ان کی ناؤ ڈبو دیتی ہیں، بنگلہ دیش جیسا مسلم ملک ان کی مدد نہ کرے، تھائی لینڈ جیسی جمہوریت نواز آبادی ان کا خیر مقدم نہ کرے، دوسری مسلم ریاستیں ان کی مدد کو نہ آئیں تو اسے ان کی شدید بے حسی اور مردہ ضمیری پر محمول کرنا چاہیے۔

مسلم ممالک کی کفن پوش دینی غیرت

کسی خاص مسلم ملک کا نام کیوں لیا جائے، سارے ہی مسلم ممالک چین کی بانسری بجا رہے ہیں، جیسے برمی مسلمانوں پر عذاب صرف انہیں پر عذاب ہے۔ پاکستان مملکتِ خداداد کہا جاتا ہے، یہ کلمہ کی بنیاد پر نقشۂ عالم پر آیا، مگر اس کی طرف سے کوئی کلمہ ترحم نہیں، شخصی طور پر ایک آدھ بیانات ارکانیوں کی حمایت میں آئے تو ضرور ہیں، لیکن حکومتِ پاکستان کان میں تیل ڈالے ہوئی ہے، مسلم ممالک کل کے کل مجرمانہ

غفلت میں مبتلا ہیں، ارکانیوں پر ایک قیامت گزر گئی، حوادث پر حوادث ہیں، روز ایک نئی آفت، ہر دن ایک نیا سانحہ، اللہ ہی جانتا ہے کہ ان کے دنوں اور راتوں پر کون سا عالم طاری ہے، زندگی وبالِ جان بن گئی، مگر مسلمانوں کی عجمی ریاستوں کے ساتھ عرب والے بھی اپنے تخت وتاج، ٹیپ ٹاپ اور شان وشکوہ میں مگن ہیں۔ وہی عرب، جنہیں قطر دہشت گرد لگتا تھا اور جس کی ناکہ بندی ان کا نصب العین بن چکی تھی، انہیں برمی بدھسٹ کی سفاکیاں نظر نہیں آتیں، سچ کہئے تو انہیں اپنے ہی ہم وطنوں کو مارنے سے فرصت نہیں تو باہری مسلمانوں سے انہیں کیا ہمدردی ہوسکتی ہے۔

الجزائر کی فوجی حکومت نے اپنے ہم وطن مسلمانوں کی لاشوں کے ڈھیر لگادیئے، سوڈان کا حسن البشیر بیس لاکھ ہم وطنوں کے گلے کاٹ چکا ہے، مصر خود اسرائیل کے چنگل میں ہے، جس کی سربراہی اسرائیل کا تعینات کردہ وائسرائے کررہا ہے، ایران کو مسلم ملک کہنا بھی زیادتی ہے، یہ واحد ملک ہے، جس کی طرف سے برمی مظلومین کے لئے کوئی جملہ نہ نکلا، وسط ایشاء میں ۵/ ریاستیں ہیں جب ان پر روس قابض تھا تو وہاں کے مسلمانوں کے لئے اسلام پر عمل کرنا بہت حد تک آسان تھا، مگر جب سے آزاد ہوئیں، حجاب اور داڑھی یہاں ممنوع ہیں، ۷۰/ سال کے بوڑھے کے سوا کسی کو نماز کی اجازت نہیں، افریقہ کا ملک نائجیر یا مسلم وعیسائی کش مکش میں الجھا ہوا ہے، ان سے پھر کیا امید قائم کی جائے اور کیوں؟ عرب ممالک پر زیادہ حیرت ہوتی ہے کہ قرآن ان کی زبان میں نازل ہوا، رسول ﷺ ان کی زبان میں مبعوث ہوے، وحی کے اولین مخاطب وہی ہیں، اسلام کے اہم ترین مفاخر انہیں کے جلو میں ہیں، مگر بے حسی اور تغافل تو دیکھیے کہ اسلامی تقاضے اور دینی تعلیمات گویا انہیں چھو کر نہیں گزریں، انہیں اللہ کلام سمجھ میں نہیں آتا، پیغمبر کی زبان ان کی سمجھ شریف میں نہیں آتی، انہیں بس وہی آتا ہے جو امریکہ بہادر کہتا ہے، اسرائیل اور برطانیہ کی بات انہیں جلدی سمجھ میں آتی ہے۔

احساسِ مروت سے محروم سعودی عرب

ان عرب ممالک میں سعودی عرب کی مجرمانہ غفلتیں امت کو زیادہ کھٹکتی ہیں، اسے اللہ نے عالم اسلام کے مرکز کا وارث بنا رکھا ہے، یہ چاہتا تو پوری مسلم برادری کو قوتِ واحدہ میں سموسکتا تھا، اسلام کے فروغ میں اس کا کردار نمایاں ترین رہ سکتا تھا، اس کے اشارے پر سارے مسلم حکمراں اپنی جانیں بھی چھڑک سکتے تھے، مگر اس نے اپنی شبیہ ایسی کبھی نہ بنائی کہ لوگ اسے مثالی تسلیم کریں، عیش وعشرت سے بھرپور

زندگی اس کے حکمرانوں کی منزل بن گئی، تصنعات، تکلفات اور لایعنی مصروفیات میں وہ ایسے ڈوبے کہ پھر ابھر نہ سکے، محلات کی تعمیر، لباسِ فاخرہ اور خلاؤں فضاؤں کی سیر ان کے مقاصدِ اولین، شاید بابر کا یہ فلسفہ انہیں زیادہ بھا گیا ہے:

ع بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

آپ احادیثِ رسول پڑھ ڈالیے، سیرتِ پیغمبر دیکھ لیجیے، صحابہ اور خیر القرون کی حیاتِ طیبہ کی ورق گردانی کیجیے تو سعودی حکمرانوں اور مذکورہ شخصیات کے درمیان کوئی مناسبت ہی نہ پائیں گے، وہ سادگی کے پیکر، یہ موج مستی کے پرستار، وہ مجاھدات کے خوگر، یہ مال و جاہ کی زلفوں میں گرفتار، وہ موت کو آنکھیں دکھانے والے، یہ موت سے تھر تھر کانپنے والے ؎

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

نتیجہ یہ کہ جسے مسلم ممالک کا سرپرست بن کر رہنا چاہیے تھا، وہ آج امریکی اور برطانوی کالونی میں تبدیل ہو چکا ہے، احساسِ مروت سے محروم اور دینی حرارت سے خالی۔

ترکی کا جرأت مندانہ اقدام

ایک ترکی ہے، جسے اللہ نے احساسِ مروت سے نوازا ہے، چالیس لاکھ شامی پناہ گزینوں کی یہ ملک مدد کر رہا ہے، برمی پناہ گزینوں کے لئے بھی اس کا وجود سایہ دار درخت ہے۔ مسلمانوں کی اہمیت اسے معلوم ہے، وہ ترکی جو کمال اتاترک کے نافرجام دور میں مردِ بیمار کہلاتا تھا، آج وہ شفایاب ہو کر بستر سے کھڑا ہی نہیں ہوا؛ بلکہ پوری توانائی کے ساتھ مسلمانوں کا مسیحا بن کر اٹھا ہے، کوئی موقع ہو، کوئی بزم ہو، کوئی مقام ہو، مسلمانوں کی حمایت میں اٹھنے والی پہلی آواز یہی اٹھاتا ہے، آج قطر کی اینٹ سے اینٹ بج چکی ہوتی، مگر ترکی کی جرأتِ رندانہ نے اپنی فوج اتار کر اسے ٹوٹنے اور بکھرنے سے بچا لیا، یہ جہاں جاتا ہے، اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کی بات کرتا ہے، اسلام دشمنوں کو للکارتا اور ایمان والوں کی پشت پناہی کرتا ہے، ہمت ہے، عزیمت ہے، جوش ہے، ہوش ہے، اکیلے ہی ساری دنیا کو آئینہ دکھا رہا ہے، برما کے مسلمانوں پر حشر برپا ہوا تو اس کی حمایت میں اولین آواز ترکی سے ہی اٹھی، آواز ہی نہیں، عمل بھی اور قدم بھی، برمی مسلمانوں کی حالتِ زار دیکھ کر ترکی وزیر اہلیہ سمیت آئے تو ان سے آنسو روکا نہ گیا، دھاڑیں مار کر رونے

لگے، یوں گلے ملے گویا برسوں کا بچھڑا بھائی اپنے بھائی سے ملا ہے، اللہ ترکی کو سلامت رکھے اور اسے ملتِ اسلامیہ کی قیادت عطا فرمائے، میرا یقین کہتا ہے اگر عرب پر ترکی قابض ہوتا تو اس کے ٹکڑے نہ ہوتے، مسلم ممالک ایک لڑی سے جڑے رہتے، عیش کوشی کی جگہ اسلام کا مفاد پیشِ نظر رہتا، اسلامی پرچم ہر جگہ لہراتا، سارا عالم اس کے زیرِ نگیں رہتا۔

اقوامِ متحدہ پر موت کا سناٹا

اپنوں کی بے حسی کے ساتھ ان لوگوں کا ذکر بھی ضروری ہے، جو ضرورت سے زیادہ مسلمانوں کے ہمدرد اور انتہا سے زیادہ انسانیت کے غمخوار کہلاتے ہیں، ان میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے ساتھ اقوامِ متحدہ بھی شامل ہیں، بلی کو جس طرح خواب میں چھیچھڑے نظر آتے ہیں، اسی طرح امریکہ کو ہر جگہ دہشت گردی دکھائی دیتی ہے، جہاں مسلمان پنپ رہے ہوں، کلمہ گو پھل پھول رہے ہوں، کوئی قیادت ابھر اور چڑھ رہی ہو، امریکہ اور اس کے مؤیدین وہاں دہشت گردی کا خزانہ ڈھونڈ نکالتے ہیں، کتنے ہی مسلم ممالک اس الزام میں تہ و بالا کر دیے گئے، کتنے ہی اقتدار زیر و زبر ہو گئے، ممالک ملبوں کے ڈھیر اور شہری ہم آغوشِ موت گئے، قیامت سے پہلے قیامتیں ٹوٹیں، اقوامِ متحدہ کو دہشت گردی وہاں کو نظر آئی، جہاں جہاں کی امریکہ بہادر نے نشان دہی کی، ورنہ امریکہ ہی طرح اس اندھی جماعت کو معدوم شے نظر آتی ہے اور موجود شے اوجھل۔ ان کج دماغوں کی دہشت گردی بھی زلفِ لیلیٰ کی طرح ان سلجھی پہیلی ہے، انہیں مسلمانوں میں امن دوستی دہشت گردی اور غیر مسلموں کی دہشت گردی پیامِ امن لگتی ہے، برما میں مسلمانوں کے ساتھ مصائب کا ایک ہمالیہ ٹوٹ پڑا، ذرائعِ ابلاغ کے ذریعے ان مظالم کی تصویریں عام ہو چکی ہیں، مگر اقوامِ متحدہ پر موت کا سناٹا طاری ہے، بدھسٹ کی یہ دہشت گردی شاید اسے دکھائی نہیں دے رہی، اگر ایسا ہے تو اسے انسانیت دوستی کا سوانگ رچانا چھوڑ دینا چاہیے، بعضوں نے کہا ہے اور صحیح کہا ہے کہ یہ عالمی تنظیم امریکہ کی داشتہ ہے، اس سے کسی خیر کی امید نہیں کی جانی چاہیے، اس کا حل مسلم ممالک کو خود ہی نکالنا پڑے گا، خواہ وہ جس طرح نکلے۔

❊ ❊ ❊ ❊ ❊ ❊

❊ ❊ ❊

آزادیٔ اظہار کا
مغربی تصور اور اسلام

عادل فراز

عصر حاضر میں انسان اپنے حقوق اور اختیارات کی طرف ماضی کے بالمقابل زیادہ متوجہ ہوا ہے۔ کیونکہ موجودہ عہد انسان کی ترقی اور کامیابی کا عہد ہے لہٰذا وہ اپنے حقوق اور اختیارات کے سلسلے میں بھی اتنا ہی بیدار ہے جتنا کہ معاشرہ کے حقوق اور اختیارات کے سلسلے میں بیدار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس معاشرہ میں بھی جہاں ماضی میں کسی نظام کا تصور نہیں تھا اور عوام کو انکے بنیادی حقوق بھی حاصل نہیں تھے آج اس معاشرہ میں انسانی حقوق کی آوازیں سب سے زیادہ بلند ہو رہی ہیں۔ چونکہ انسان تمام ذی روحوں میں سے سب سے اہم اور حساس ہے لہٰذا اسکے تقاضے اور ضروریات بھی دوسرے ذی روحوں سے زیادہ اور اہم ہیں۔ ان تمام تر تقاضوں میں ایک ایسا مطالبہ ہے جو انسان اپنے فطری تقاضہ کے تحت کرتا آیا ہے۔ اس مطالبہ کا نام ہے ''آزادی''۔ انسان ہر طرح کی آزادی کا خواہش مند ہے مگر اظہار کی آزادی کا مطالبہ زیادہ شدت کے ساتھ کیا جاتا رہا ہے۔ معاشرہ میں اپنے خیالات و افکار کی ترسیل و تبلیغ اور دوسروں کے خیالات سے استفادہ کرنے کے لئے آزادیٔ اظہار کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے مگر ہر معاشرہ اگر وہ کسی نظام کا پابند ہے اظہار کی آزادی کی بھی حدیں معین کرتا ہے۔ موجودہ عہد میں ''آزادیٔ اظہار'' کا نعرہ مغرب کی کوکھ سے جنم لیتا ہے کیونکہ تمام جدید نظریات و افکار جنھیں بنام جدیدیت پیش کیا جارہا ہے مغرب کی ہی کوکھ سے جنم لے رہے ہیں یہ الگ مسئلہ ہے کہ ان تمام تر نئے نعروں میں نئے جیسا کچھ نہیں ہے۔

مغرب نے درحقیقت انسان کو آزادیٔ اظہار کے نام پر فقط فریب دیا ہے۔ مغرب نے جس ''آزادی'' کے نعرہ کو بلند کیا ہے اس نعرہ کا مطلب فقط ''مذہب اور خدا سے آزادی'' ہے۔ میں آج تک آزادی کے نعرہ کا مفہوم اس مفہوم سے الگ نہیں سمجھ سکا کیونکہ جس آزادی کا نعرہ مغربی مفکرین نے بلند کیا تھا وہ نعرہ مذہب اور مذہبی بالادستی کے خلاف تھا۔ لہٰذا جس آزادی کو ہم آج غلامی کے تصور سے نجات کا نعرہ

سمجھتے ہیں دراصل خدا اور مذہب سے نجات کا نعرہ ہے۔ ورنہ انسان نہ آزاد پیدا ہوا ہے اور نہ آزاد رکھا گیا ہے۔ کیونکہ انسان کے خالق نے اسے ایک مقصد کے لئے خلق کیا ہے تو پھر اسے آزاد کیسے چھوڑا جا سکتا ہے۔ ہاں انسان کسی بھی مسئلے اور معاملہ میں غور و فکر اور امور کی انجام دہی میں پوری طرح آزاد ہے۔ اگر وہ اس آزادی کا غلط استعمال کرتا ہے تو خالق نے سزا رکھی ہے۔ اور اگر خالق کی رضا کے مطابق عمل کرتا ہے تو اس کی جزا بھی معین کی گئی ہے۔ لہٰذا انسان کو اس ''تصور آزادی'' سے نجات دینے کے لئے مغرب نے ''جدید آزادی'' کا نعرہ بلند کیا۔ گویا انسان پر کسی کا اختیار نہیں۔ وہ اپنے ہر کام کی انجام دہی میں پوری طرح آزاد ہے۔ خواہ شراب و شباب کا دلدادہ ہو کر عیش و نوش میں زندگی بسر کر دے یا ایک سادہ لوح انسان کی طرح عمر گزار کر مر جائے۔ مگر اس ''آزادی کے جدید تصور'' میں بھی جزا و سزا کا معیار مقرر کیا گیا ہے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ کیا گیا ہوتا تو پھر یہ آزاد انسان سماج و معاشرہ کے لئے ناسور بن جاتا یعنی قانون کی بالادستی کی اہمیت یہاں بھی سمجھی جا سکتی ہے ورنہ آزاد سماج میں عدالتوں اور قید خانوں کی ضرورت نہ ہوتی۔

آزادیٔ اظہار کی اہمیت پر بین الاقوامی انسانی حقوق کے منشور کے آرٹیکل ۱۹ میں کہا گیا ہے ''ہر شخص کو اپنی آرا رکھنے کا اختیار ہوگا اور اس سلسلے میں کوئی مداخلت نہیں ہوگی۔ ہر شخص کو آزادیٔ اظہار کا پورا حق حاصل ہوگا۔ اس حق میں ہر طرح کے نظریات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے اور معلومات دوسروں تک پہنچانے کی آزادی شامل ہوگی۔ سرحدیں اس حق کی راہ میں حائل نہ ہونگی۔ یہ معلومات تحریری صورت میں، زبانی طور پر، یا کسی آرٹ کی شکل میں یا کسی اور مطلوبہ ذریعہ سے حاصل کی جا سکتی ہیں''۔ مگر حقوق انسانی کے منشور میں بھی آزادیٔ اظہار کی حدیں معین کی گئیں اور انسان کو مکمل آزادی نہیں دی گئی۔ آزادیٔ اظہار کے حدود متعین کرتے ہوئے شق نمبر ۲ میں کہا گیا ہے کہ آزادیٔ اظہار کے حق کا استعمال کرتے ہوئے کچھ فرائض اور ذمہ داریاں بھی نافذ ہونگی مثلاً:

۱۔ دوسروں کی عزت، شہرت اور حقوق متصادم نہ ہوں۔

۲۔ قومی سلامتی، امن عامہ، صحت عامہ، یا اخلاق عامہ متاثر ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔

یہ آزادیٔ اظہار کا دوسرا رخ ہے۔ یعنی ایک انسان کو بیک وقت آزادی بھی دی گئی ہے اور پابند بھی رکھا گیا ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو انسان معاشرہ کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے لہٰذا آزادیٔ اظہار کے قانون وضع کئے گئے۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ آج کا نظام جو کسی بھی طرح کی مکمل آزادی کی اجازت نہیں دیتا وہ نظام اسلام کے نظام کی حدود و قیود پر تنقید کرتا ہے؟۔ اگر دنیا کی ہر حکومت اپنے شہریوں کے مفاد میں قانون وضع کرتی ہے اور آزادی کے ساتھ آزادی کے حدود بھی متعین کرتی ہے تو پھر اسلام جو دنیا کی

ترقی اور نجات کا عالمی منشور لیکر آیا ہے وہ اپنے قانون کے تحت مکمل آزادی کیسے دے سکتا ہے۔ دنیا کا ہر قانون مشروط ہوتا ہے اور یہ مشروطیت ہی اس قانون کی بقا اور ترقی کی ضمانت ہوتی ہے۔ مغربی مفکرین اور وہ اسکالرز جو روشن خیالی کے عذاب میں مبتلا ہیں آزادیٔ اظہار کے سلسلے میں اسلام کے حدود و قیود پر طنز و تشنیع کرتے نظر آتے ہیں مگر اسلام دشمنی میں یہ بھول جاتے ہیں کہ جس نظام کو وہ مثالی نظام کی شکل میں پیش کررہے ہیں وہ نظام بھی حدود و قیود کے بغیر وجود میں نہیں آیا۔ مثال کے طور پر کینا ڈا میں عیسائیت کی اہانت کو جرم قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ کینا ڈا کی حکومت کو اس بات کا خدشہ تھا کہ آزدیٔ اظہار کی مکمل آزادی انسان کو مذہب کی اہانت و منقصت پر اکساتی ہے۔ ممکن ہے ایک انسان خواہ وہ عیسائی ہو یا غیر عیسائی اسکے عقائد و نظریات کی توہین کا مرتکب ہو یا وہ انسان کو عیسائیت کے خلاف ورغلا کر کسی دوسرے مذہب یا نظریہ کی دعوت نہ دے۔

۲۷/جنوری ۲۰۰۳ میں ٹیلی گراف اخبار نے اسرائیلی وزیر اعظم کا خاکہ شایع کیا جس میں انہیں فلسطینی بچوں کی کھوپڑیاں کھاتا ہوا دکھایا گیا۔ اس خاکہ پر اسرائیل اور اسکے ہم نواؤں نے ہنگامہ کھڑا کردیا جس کے بعد اخبار نے معذرت کی۔ امریکہ جو پوری دنیا میں ماڈرن کلچر اور فریڈم آف اسپیچ کا دعویدار ہے وہاں بھی لوگوں کے فون ٹیپ کئے جاتے ہیں۔ لیبیا میں جس وقت توہین رسالت اور اہانت قرآن کے جرم میں مظاہرین نے امریکی ایمبیسی کو نذر آتش کیا اسکے فوراً بعد اقوام متحدہ نے اس نازک مسئلے پر اجلاس طلب کیا۔ اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے امریکی صدر نے کہا کہ ''توہین رسالت و اہانت قرآن آزادیٔ رائے کی ایک شکل ہے ،امریکی آئین اسے تحفظ دیتا ہے۔ امریکی عوام کی اکثریت عیسائی ہے اسکے باوجود ہم عیسیٰ کی توہین پر قدغن نہیں لگا سکتے''۔ امریکی نظام کا دوغلا پن اور دہرا معیار اس وقت سامنے آتا ہے جب وہ اپنے آئین میں امریکہ کے قومی پرچم کی توہین، قومی پرندے کی قید اور عدالتوں کی ہتک پر فرد جرم عائد کرتے ہیں۔

بیلجیم میں ایک قانون کے مطابق ہولوکاسٹ کے خلاف لب کشائی کی اجازت نہیں ہے اگر کوئی ہولوکاسٹ کے ہونے کا انکار کرتا ہے تو اسکے لئے قید اور جرمانہ کی سزا معین کی گئی ہے۔ اسی طرح کناڈا میں بھی ہولوکاسٹ کی تردید پر سزا رکھی گئی ہے۔ کئی مغربی ممالک جیسے فرانس، ناروے، انگلینڈ، ہالینڈ اور کئی دیگر شہروں میں یہ قانون موجود ہے کہ کسی مذہب، عقیدہ، مسلک یا فرد کے افکار کے خلاف تقریر نہیں کی جاسکتی جو ہتک اور تضحیک پر مبنی ہو۔ ہندوستان میں بھی ایسی تقاریر پر پابندی عائد ہے جو مذہبی جذبات برانگیختہ کرے اور کسی عقیدہ، مسلک یا فرد کی تضحیک کا سبب قرار پائے اور نقض امن کا ذریعہ بنے۔ حال ہی میں امریکہ نے سات مسلم ممالک کے شہریوں پر امریکہ میں داخلہ پر پابندی عائد کردی تھی جسکے خلاف

امریکی عدالت نے سخت قدم اٹھاتے ہوئے اس فیصلہ کی مذمت کی اور پابندی کو ہٹانے کا حکم دیا۔ابھی تک اس متنازع فیصلہ پر عدلیہ اور ٹرمپ انتظامیہ میں کشیدگی برقرار ہے مگر اس فیصلہ کے بعد مغرب کا اسلاموفوبیا کھل کر سامنے آتا ہے۔مسلمانوں کے امریکہ میں داخلہ پر پابندی عائد کرنے والی حکومت آزادئ اظہار کی کلّی اجازت کیسے دے سکتی ہے۔

اکثر میڈیا کے ذریعہ خبریں موصول ہوتی ہیں کہ فلاں مغربی ملک نے حجاب پر پابندی عائد کردی ہے۔فلاں اسکول اور کالج میں جبہ پہننے پر روک لگادی گئی۔فلان یونیورسٹی میں قرآن کی تعلیم پر قدغن لگادیا گیا۔جرمنی اور فرانس جیسے ملکوں میں بھی حجاب پر بین ہے۔ہندوستان کے بھی کئی اسکولوں اور کالجوں میں حجاب پہننے پر پابندی عائد ہے۔ہندوستانی بینکوں میں بھی اب اس طرح کی تختیاں آویزاں کی جارہی ہیں کہ بینک میں باحجاب اور بانقاب آنے کی اجازت نہیں ہے۔وزیرداخلہ راج ناتھ سنگھ نے پارلیمنٹ کو خطاب کرتے ہوئے''سیکولر''لفظ کے معنی میں اپنی حکومت کے نظریات کے مطابق ترمیم کی تھی۔انہوں نے کہا تھا کہ سیکولر ہونے کا مطلب''دھرم نرپیکش''ہونا نہیں ہے بلکہ''پنتھ نرپیکش''ہونا ہے۔یعنی سیکولر ریاست میں مذہب کی آزادی نہیں ہوسکتی بلکہ صرف عقیدہ کی آزادی دی جاسکتی ہے۔راج ناتھ سنگھ کا مقصود تھا کہ سیکولر ریاست میں مذہب ریاست کا ہی عام ہوگا اور دیگر مذاہب کے افراد اپنے عقیدہ کے لئے آزاد ہوں گے کیونکہ عقیدہ کا تعلق دل سے ہوتا ہے۔

ان مثالوں سے یہ اندازہ بخوبی ہوجاتا ہے کہ مغربی معاشرہ اور ہمارا سماج جس آزادی اظہار کی دہائی دیتا ہے دراصل وہ خود اس کی مکمل اجازت کی حمایت نہیں کرتا۔ہر نظام میں آزادی کے حدود وقیود بیان کئے گئے ہیں مگر اسلام مخالف مفکروں نے پوری منصوبہ بندی کے ساتھ فقط اسلام کو نشانہ بنانے کی کوشش کی ہے اور اپنے نظام کی کمیوں اور خامیوں کی پردہ پوشی کی ہے۔المیہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں بھی کچھ زیادہ ہی پڑھا لکھا طبقہ مغربی جھانسہ میں آکر لبرل اور سیکولرازم کا ڈھنڈورچی ہوگیا ہے۔یا تو یہ لوگ مغرب کی اسلام دشمنی کی سازشوں کا دانستہ طور پر شکار ہیں یا نادانی میں شکار ہورہے ہیں۔

ایسے حالات میں یہ کہنا کہ اسلام آزادئ اظہار کے خلاف ہے اور اسکا قانون فرد کی آزادی پر قدغن لگاتا ہے خلاف عقل اور مبنی برعصبیت ہے۔جس طرح دنیا کا ہر قانون فرد اور معاشرہ کی آزادی کے لئے قانون وضع کرتا ہے تا کہ امن عامہ برقرار رہے اسی طرح اسلام بھی آزادی کا اپنا تصور پیش کرتا ہے تا کہ معاشرہ فساد سے محفوظ رہے۔

جامعہ کی سرگرمیاں

مولانا فضیل احمد ناصری

استاذ حدیث جامعہ ہذا

عیدقرباں کی تعطیل

تعلیمی سال کی دوسری تعطیل کلاں ۲۹/اگست تا ۸/ستمبر، مطابق ۶/ذی الحجہ تا ۱۷/ذی الحجہ ۱۴۳۸ھ جاری رہی، یہ تعطیل دس دنوں پر مشتمل تھی، قریب وبعید کے طلبہ اور اساتذہ اپنے اپنے وطن کو روانہ ہو گئے، ملکی حالات کی نزاکت کے پیش نظر طلبہ کو رہنما ہدایات بھی دی گئیں، جنہیں دورانِ سفر طلبۂ کرام ملحوظ رکھیں۔ فضول گوئی، جذباتیت، اشتعال انگیزی اور تکلیف دہ گفتگو سے حتی الامکان بچنے کی تلقین کی گئی، تا کہ کسی طرح کے ناخوشگوار واقعات کو راہ ہی نہ مل سکے۔

مقیم طلبہ کے لیے قیام وطعام کا انتظام

تعطیل عیدقرباں میں دور دراز صوبوں کے بعض طلبہ جامعہ میں ہی مقیم رہے، مطبخ اگر چہ بند رہا، مگر ان کے لیے طعام کی خدمات جامعہ کی طرف سے جاری رہیں، رئیس الجامعہ حضرت مولانا سید احمد خضر شاہ مسعودی کشمیری دامت برکاتہم نے چند ایام اپنے گھر پر ان طلبہ کی ضیافت بھی فرمائی۔

جامعہ میں قربانی کا انتظام

ہر سال کی طرح اس ذی الحجہ میں بھی جامعہ نے قربانی کا اہتمام کیا، بڑے چھوٹے سارے جانوروں کی قربانی احاطۂ جامعہ میں ہی ہوئی، قربانی کا گوشت شریعت کے مطابق تقسیم کیا گیا، طلبہ اور اساتذہ کو بھی حسب سابق گوشت دیا گیا، قربانی کے جانور ماضی ہی کی طرح صحت منداور شرعی معیار پر تھے، گزشتہ برسوں کے مقابلے میں راہِ خدا میں قربان ہونے والے جانوروں کی تعداد اس مرتبہ زیادہ رہی۔

ماہانہ امتحان کا انعقاد

ابتدائی جماعتیں طلبہ کے لیے بنیاد کا پتھر ہوتی ہیں، یہی جماعتیں اور ترتیبیں مستقبل کا نقشہ بناتی ہیں، اسی نکتے کے پیش نظر جامعہ میں ابتدائی جماعتوں کے امتحانات ماہانہ منعقد ہوتے ہیں، ضابطہ کے مطابق درجۂ اعدادیہ سمیت عربی اول تا عربی سوم کے امتحانات ہر ماہ لازم ہیں، عربی پنجم بھی اس ضابطے میں داخل ہے۔ ان جماعتوں کا ماہانہ امتحان محرم میں منعقد ہوا، جس میں طلبہ نے پوری تیاری کے ساتھ حصہ لیا، نتائج بھی حوصلہ بخش رہے، حضرات ممتحنین نے مثبت پہلوؤں کو بہ نظر استحسان دیکھا، جب کہ کمزور گوشوں کی نشاندہی کر کے ادارہ کو ممنون بھی کیا۔ **فجزاهم الله**۔

ممتاز نمبرات لانے والے طلبہ

اعدادیہ: حمزہ مرغوب، دیوبند، اول۔ تقی احمد، ارریہ، دوم۔ محمد اکمل خان، شاملی، سوم۔

عربی اول: ذیشان فاروق، کشمیر، اول۔ عبدالسلام، سہارن پور، دوم۔ محمد وسیم، باغپت، سوم۔

عربی دوم: محمد حماد، متھرا، اول۔ محمد حذیفہ، سدھارتھ نگر، دوم۔ محمد ناظر، جھارکھنڈ، سوم۔

عربی سوم: محمد ارمان نہال، کوڈرما، اول۔ راشد لطیف، جموں، دوم۔ نور محمود الحسن، آسام، سوم۔

عربی پنجم: محمد سہیل، ہریدوار، اول۔ فاروق عبداللہ، راجستھان، محمد شوکت علی، اڑیسہ، عبدالماجد، کبیر نگر، دوم۔ منظور احمد، جموں، سوم۔

شش ماہی امتحان کا اعلان

دریں اثناء جامعہ میں ہونے والے شش ماہی امتحان کا اعلان کر دیا گیا ہے، یہ امتحان ۵ر تا ۲۰ر نومبر جاری رہے گا، اس کے بعد ۱۳ر دنوں کی تعطیل بھی رہے گی، جو ۲۱ر نومبر تا ۳ر دسمبر جاری رہے گی، ہر جماعت کی ایک ایک کتاب کا امتحان روک لیا جائے گا، تعطیل پوری ہوتے ہی دسمبر کی چوتھی تاریخ کو اس کا امتحان ہوگا، تعلیمی نظام کو مؤثر اور مزید بہتر بنانے کے لئے پچھلے سال سے یہ نظام جاری ہے۔

شش ماہی امتحان کے موقع پر دیوبند و اطراف کے ممتاز مدرسین کو مدعو کیا جائے گا، تاکہ طلبہ کی جانچ مضبوط بنیادوں پر ہو اور ان کی کمی و خامی دریافت کر کے اسے دور کیا جائے۔

انور ہال کے باقی ماندہ حصے کی تعمیر تکمیل کے قریب

الحمدللہ! جامعہ کا دارالحدیث شدہ شدہ تکمیل کے آخری مراحل میں ہے، امید ہے کہ بہت جلد پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گا، سر دست تحتانی حصے کے برآمدے پر چاروں طرف بہترین قلعی کا کام جاری ہے، کئی حصے مکمل ہو چکے ہیں، کھڑکیوں اور کواڑوں کی پالش اور رنگ وروغن کے کام سے بھی فراغت ہو چکی، اس کے ماسوا پہلی منزل کے برآمدے پر چاروں طرف خوب صورت ٹائلس کے فرش بھی بچھا دیے گئے ہیں، الحمدللہ کام تیزی سے جاری ہے۔

دارالحدیث کے تحتانی حصے کی ریلنگ مکمل

جامعہ کے عظیم دارالحدیث کے تحتانی حصے پر جہاں دیگر سرگرمیاں چل رہی ہیں، وہیں ریلنگ کا کام بھی پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا ہے، ہال کے اوپر چاروں سمتوں کو محیط بالکنیوں پر ریلنگ چڑھا دی گئی ہے، جس سے ایک طرف سے دوسری طرف جانا محفوظ ہو گیا ہے، یہ ریلنگ زینوں ہی کی طرح اسٹیل کی ہے، ڈیزائن اور کام بہت خوشنما ہے، اس سے دارالحدیث کا تحتانی حصہ مزید دل کش اور جمال افروز ہو گیا ہے۔

روشنی کے مزید انتظامات

گرچہ جامعہ میں روشنی کا معقول بندوبست پہلے بھی رہا ہے، مگر اب اس کے انتظامات میں مزید اضافے کئے گئے ہیں، دارالحدیث انور ہال کے مشرقی ومغربی حصے نسبتۂ اندھیرے میں رہتے تھے، اسی طرح مسجد کا بیرونی حصہ، نیز صحن چمن قلت روشنی کی شکایت کرتے تھے، اب ان مقامات پر بڑی بڑی لائٹیں اونچے ستونوں کے ساتھ نصب کر دی گئی ہیں، جن سے روشنی کا بندوبست مزید بہتر اور کیف آور ہو گیا ہے۔

عاشورہ کے موقعے پر طلبہ کی ضیافت

محرم الحرام کی دسویں تاریخ اسلامی نقطۂ نظر سے خاص اہمیت کی حامل ہے، اس دن روزہ رکھنا سنت ہے، پیغمبر علیہ السلام بڑے اہتمام سے اس کا روزہ رکھا کرتے تھے، پیغمبر علیہ السلام کی محبت میں ان کی امت متواتر روزے رکھتی آئی ہے، چناں چہ اس مرتبہ بھی طلبہ نے حسب سابق اپنی مرضی سے روزے

رکھے، اس موقع پر معمول سے ہٹ کر طلبہ کی مزید بہتر کھانے سے ضیافت کی گئی، ان کے افطار کے لئے بھی شاندار انتظامات رہے۔

آرائش چمن

جامعہ میں چمن بندی کو بھی خصوصی اہمیت دی جاتی رہی ہے، اس کے لیے ایک مالی کی خدمات بھی مستقلاً میسر ہیں، موسم بہار میں یہ چمن اپنی رعنائیوں سے ناظرین کو مسحور کر دیتا ہے، اس کی آرائش وتزئین بھی برابر ہوتی رہتی ہے، جس سے اس کا بانکپن اور اس کی دل پذیری پُرشباب رہتی ہے، حال ہی میں باب معظم شاہ سے مسجد انور شاہ تک جانے والی دیوار سے متصل اونچے اونچے خوب صورت درختوں کو تراش خراش کر کے مزید خوشنما کر دیا گیا، جس سے صحنِ چمن اچھی طرح نکھر گیا ہے، جامعہ کا چمن مختلف رنگ کے پھولوں، جمال افروز پودوں اور بہار آفریں غنچوں سے ہر وقت مسکراتا ہے۔

وفیات

حضرت مولانا مفتی اشرف علی باقوی صاحب کا انتقال پُر ملال

بنگلور کے سرکردہ عالم معروف داعی و مصلح حضرت مولانا مفتی اشرف علی باقوی مختصر علالت کے بعد دنیا سے رخصت ہو گئے، ان کی وفات سے پوری علمی برادری سوگ وار ہو گئی۔ مولانا موصوف کرناٹک کے امیر شریعت اور جامعہ سبیل الرشاد بنگلور کے مہتمم تھے، مسلمانوں کے ہر طبقے میں ان کا احترام تھا، اللہ نے ان سے بڑا کام لیا، وہ دارالعلوم وقف کے رکن مشاورت بھی تھے، ملت کی رہ نمائی میں ہمیشہ پیش پیش رہتے، ان کے انتقال سے ایک بڑا خلا پیدا ہوا ہے، اللہ انہیں غریق رحمت فرمائے۔

ان کے انتقال پر جامعہ میں دعائے مغفرت کی گئی، حضرت رئیس الجامعہ دام ظلہ نے مولانا کی وفات پر رنج وغم کا اظہار فرمایا اور پسماندگان سے تعزیت مسنونہ پیش کیا۔

سید راحت شاہ کی رحلت

امام العصر علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کے پوتے اور اپنے زمانے کے قدآور قلم کار مولانا سید ازہر شاہ قیصر کے فرزند محترم جناب سید راحت شاہ قیصر کا طویل علالت کے بعد انتقال ہو گیا، اللہ ان کی مغفرت

فرمائے، پسماندگان میں بیوہ اور اولاد کے علاوہ بھائی اطہر شاہ، مولانا سید نسیم اختر شاہ قیصر اور سید وجاہت شاہ زید مجدہم بھی شامل ہیں، جامعہ میں ان کے لئے بھی دعائے مغفرت ہوئی۔

قاری بلال احمد صاحب کے والد کا انتقال

جامعہ کے قدیم ترین استاذ محترم جناب قاری بلال احمد صاحب زید مجدہم کے والد ماجد محترم جناب حبیب احمد صاحب کا مختصر علالت کے بعد انتقال ہو گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون، مرحوم نہایت سادہ، ملنسار، پابند صوم وصلوۃ اور خوش اخلاق مومن تھے، ۱۰۰؍برس کے آس پاس انہوں نے عمر پائی، مسجد سے نماز پڑھ کر گھر واپسی کررہے تھے کہ سڑک پار کرتے ہوئے ایک گاڑی نے ٹکر ماردی، جس میں ان کو شدید چوٹیں آئیں، بالخصوص دماغ زیادہ متأثر ہوا، ہفتہ عشرہ کوما میں رہ کر ۲۹؍اکتوبر ۲۰۱۷ء کو جان جانِ آفریں کے سپرد کردی۔

انتقال کی خبر معلوم ہوتے ہی جامعہ میں دعاؤں کا اہتمام ہوا اور مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کی گئی، جامعہ سے تعزیت کے لئے حضرت رئیس الجامعہ دامت برکاتہم سمیت متعدد اساتذہ بھی قاری صاحب کے گاؤں چالاک پور چلکانہ تشریف لے گئے، مفتی نثار خالد، مفتی وصی احمد بستوی، مولانا ابوطلحہ اعظمی، احقر فضیل احمد ناصری اور ماسٹر زعیم عابد زید مجدہم نے گھر جا کر قاری صاحب کو تعزیت پیش کی، حضرت رئیس الجامعہ مدظلہ نے قاری صاحب اور اہل خانہ سے تعزیت کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ بالیقین بڑا حادثہ ہے، مگر ایسے موقعے پر ہمارے مذہب نے صبر کی تلقین کی ہے، جس کا ان شاء اللہ اجر ملے گا، جامعہ آپ کے دکھ درد میں برابر کا شریک ہے، اللہ مرحوم کو جنت الفردوس عطا فرمائے۔ آمین

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''(کامل اور سچا) مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے (ایذا سے) مسلمان محفوظ رہیں اور (پکا وصادق) مؤمن وہ ہے جس سے لوگ اپنی جان واپنے مال کو مامون سمجھیں'' (ترمذی، نسائی) اور شعب الایمان میں بیہقی نے فضالہؓ سے جو روایت نقل کی ہے اس میں یہ الفاظ بھی ہیں ''اور (حقیقی) مجاہد وہ ہے جس نے اللہ کی طاعت وعبادت میں اپنے نفس سے جہاد کیا اور (اصل) مہاجر وہ ہے جس نے تمام چھوٹے اور بڑے گناہوں کو ترک کردیا۔ (ترمذی)

Monthly MUHADDIS-E-ASR Deoband

Register from Registrar of Newspapers for India U.P. URD.2000/R.N.10663

Contact: (Off) 01336-220471, Mob. +91 8006075484

Email: ahmadanzarshah@gmail.com

Printed & Published by Syed Ahmad Khizar Shah,
Mohtamim of behalf of JIMAS, Behind Eidgah, DBD
and Printed at Mukhtar Press, Samreen Printers, Deoband

مسجد انور شاہ کا دیدہ زیب نظارہ

انور ہال

مسجد انور شاہ کے برآمدے کا منظر

دارالحدیث (انور ہال) سے بابِ معظم شاہ تک نوتعمیر شدہ سڑک

دفتر تعلیمات و دفتر اہتمام کا برآمدہ

دارالاقامہ کا اندرونی منظر

کتب خانہ

جامعہ کا مطبخ